عِلمُ التَّجوِید



زینتُ القراء قارِی غلام رسُول مدظلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ط

علم التجوید

مؤلف

حضرت زینت القراء مولانا قاری غلام رسول صاحب مدظلہ العالی

قاری ریڈیو پاکستان و ٹیلیویژن
صدر انجمن فروغ تجوید و قرأت پاکستان
مہتمم جامعہ تجوید القرآن، پاکستان

الناشر

صاحبزادہ محمد مبشر ناظم مکتبہ فروغ تجوید و قرأت

نورانی جامع مسجد صدر بازار لاہور چھاؤنی





نام ——— علم التجوید

مؤلف ——— قاری غلام رسول

مطبع ——— نقوش پریس اُردو بازار

بتاریخ ——— ٢٦ ربیع الثانی شریف ١٣٨٧ھ

تعداد ——— ٢٠٠٠

بار ——— دوم مع ترمیم جدید

ملنے کا پتہ :-

١- نورانی جامعہ مسجد صدر بازار لاہور چھاؤنی

٢- جامعہ تجوید القرآن ٤٠ میکلوڈ روڈ لاہور

مقدمہ

(از جناب تصدّق حسین صاحب بی، اے۔ بی ٹی۔ پرنسپل انجمن اسلام کُرلا ہائی اسکول)

یوں تو اردو زبان میں علم عروض، صنائع بدائع، اور اقسامِ نظم پر بہت سی ضخیم کتابیں موجود ہیں، لیکن اب تک کوئی ایسی مختصر مگر جامع کتاب موجود نہیں تھی، جس میں فن شعر کے ان اصولوں سے بحث کی گئی ہو جن کا جاننا اردو شاعری کے طالب علم کے لئے ضروری ہے۔

اس کتاب میں ردیف و قافیہ کے علاوہ مضمون کے اعتبار سے بھی نظم کی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ ان انگریزی طرز کی نظموں کی مثالیں بھی ہیں جو اردو شاعری میں رواج پا گئی ہیں۔ محاسن نظم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صنائع بدائع کا بیان ہے۔ تقطیع کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ مروجہ بحروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ غرض نظم سے متعلق ان تمام چیزوں کا ذکر اس میں موجود ہے جو ایک طالب علم جاننا چاہتا ہے۔

جامعیت اور اختصار کے علاوہ اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ نظموں کی قسمیں بتاتے ہوئے مثال کے طور پر جو نظمیں دی گئی ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ صنائع بدائع سے متعلق جو اشعار تمثیلاً درج کئے گئے ہیں وہ نہایت موزوں ہیں۔ یہ انتخاب اس قدر دلپذیر ہے کہ صنائع بدائع اور دیگر محاسن شعری سے واقفیت کا افادی پہلو بھی اگر پیشِ نظر نہ ہو تب بھی اس کتاب کا مطالعہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔ میرے خیال میں یہ کتاب طلبہ کے علاوہ ان لوگوں کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی جو اردو شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

تصدق حسین

بمبئی، ۷ر جنوری ۱۹۵۵ء

علم ہجا سادہ آوازوں کو تحریری علامات میں لانے کا نام حرف ہے۔ ہجا میں حروف کی آواز اور ان کی حرکات سے بحث کی جاتی ہے۔ یہ حروف اردو زبان میں کل (۵۳) ہیں جو حروف تہجی یا حروف ہجا کہلاتے ہیں۔ (تہجی یا ہجا کے معنی جوڑنے کے ہیں) وہ حروف بالترتیب یہ ہیں:۔

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی ے۔

چونکہ اردو زبان ہندی، فارسی اور عربی سے مل کر بنی ہے، لہذا اس میں ان سب زبانوں کے حروف موجود ہیں۔

خاص عربی حروف یہ ہیں:۔ ث ح ذ ص ض ط ظ ع غ

خاص ہندی حروف یہ ہیں:۔ ٹ ڈ ڑ

خاص فارسی حروف یہ ہیں:۔ پ چ گ ژ

کسی زبان کے خاص حرف ہونے سے یہ مطلب ہے کہ اگر ان میں سے کوئی حرف کسی لفظ میں آئے گا، تو وہ لفظ اسی زبان کا ہوگا۔ مثلاً ٹ ڈ ڑ ہندی کے حرف ہیں تو ٹاٹ ڈر۔ تاڑ ہندی کے الفاظ ہوں گے۔ اسی طرح پدر۔ چاک۔ گرژدم فارسی کے لفظ ہیں۔ ثبوت علم۔ صبر۔ ضرور۔ دق عربی کے لفظ ہیں۔

علاوہ ان تین حروف (ٹ۔ ڈ۔ ڑ) کے چند اور حروف بھی ہیں، جو خاص ہندی ہیں اور عربی فارسی میں نہیں آتے۔ اب تک اردو میں یہ سادہ حروف نہیں سمجھے جاتے تھے بلکہ ان میں کا ہر حرف دو حرفوں کے میل سے ایک مرکب آواز خیال کیا جاتا تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں ہم نے اپنی بول چال فارسی حروف میں لکھنی شروع کی۔ فارسی، عربی میں یہ آوازیں نہیں ہیں اور نہ ان کے لئے حروف ہیں۔ ضرورت کے لئے ان دو آوازوں کو دو دو حرفوں کے ذریعے سے ظاہر کرنا پڑا۔ یوں تو یہ سادہ آوازیں ہیں، مگر

مل کر ایک ہوگئی ہیں۔ وہ حروف یہ ہیں:۔

بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ رھ ڑھ کھ گھ لھ مھ نھ

چونکہ ان حروف میں پہلی سادہ آواز (ہ) کی آواز کے ساتھ مل کر آتی ہے۔ اس لئے معمولی (ہ) سے امتیاز کرنے کے لئے دو چشمی (ھ) سے لکھتے ہیں۔

مثلاً کھا اور کہا دو علاحدہ لفظ ہیں، تلفظ میں بھی اور معنوں میں بھی۔ لہذا املا میں بھی فرق کرنا چاہیے۔ اس حساب سے اردو زبان میں کل حروف تہجی پچاس (۵۰) ہوتے ہیں۔

ہمزہ (ء) اسے غلطی سے حروف میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت ی اور واؤ کے ساتھ وہی کام دیتا ہے جو مد (~) الف کے ساتھ۔ یعنی جہاں ی کی آواز کھینچ کر نکالنی ہو اور قریب دو (ی) کے ہو، یا جہاں واؤ کی آواز معمول سے بڑھ کر نکالی جائے وہاں بطور علامت کے اسے لکھ دیتے ہیں۔ یہ ہمیشہ (ی) یا (و) کے ساتھ آتا ہے۔ جیسے کئی۔ تئیں۔ کھاؤں۔

علم ہجا، وہ علم ہے جس میں حرفوں کا بیان ہو۔ اور فائدہ اس کا یہ ہے کہ حرفوں کا صحیح تلفظ معلوم ہو جاتا ہے۔

ابجد حروف کے مجموعے کو ابجد کہتے ہیں۔ ابجد کا لفظ ابتدائی حروف ا۔ ب۔ ج۔ د۔ سے بنا ہے۔ حرفوں کے اعداد مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ جن سے تاریخ گوئی میں کام لیا جاتا ہے۔ لغت میں تاریخ کے معنی کسی وقت کا بتانا ہے اور شعرا کی اصطلاح میں تاریخ اس کو کہتے ہیں کہ کسی واقعے کا وقت یا عمارت کی تعمیر کا زمانہ حرفوں کے اعداد سے ظاہر کیا جائے۔ حرفوں کے اعداد اس طرح مقرر ہیں:۔

ا ۱	ب ۲	ج ۳	د ۴	ہ ۵	و ۶	ز ۷
ح ۸	ط ۹	ی ۱۰	ک ۲۰	ل ۳۰	م ۴۰	ن ۵۰
س ۶۰	ع ۷۰	ف ۸۰	ص ۹۰	ق ۱۰۰	ر ۲۰۰	ش ۳۰۰
ت ۴۰۰	ث ۵۰۰	خ ۶۰۰	ذ ۷۰۰	ض ۸۰۰	ظ ۹۰۰	غ ۱۰۰۰

حروف ابجد کو یوں پڑھتے ہیں:۔

اَبْجَد ، ہَوَّز ، حُطِّی ، کَلِمَن ، سَعْفَص ، قَرَشَت ، ثَخَذ ، ضَظَغ

ان کے علاوہ اور بھی حروف اردو میں آتے ہیں جیسے پ اس کے دو عدد ب کے برابر لئے جاتے ہیں۔ ٹ کے چار سو عدد ت کے برابر۔ چ کے تین عدد ج کے برابر۔ ڈ کے چار عدد د کے برابر۔ ڑ کے دو عدد ر کے برابر۔ ژ کے سات عدد ز کے برابر۔ گ کے بیس عدد ک کے برابر۔

تاریخ لکھنے میں مکتوبی حروف کا عدد لیا جاتا ہے یعنی حرفوں کی شکل پڑھنے میں آئیں یا نہ آئیں جیسے عبدالرؤف، اس میں الف، لام کے بھی عدد لئے جائیں گے۔

تاریخ کہنے کے دو طریقے مروج ہیں (۱) صوری یعنی لفظوں میں سن کے اعداد ظاہر کر دیں جیسے:۔

ع تیرہ سو چھبیس تھے ہجری کے سن۔

(۲) معنوی یعنی حرفوں کے اعداد سے تاریخ نکالی جائے۔ یہ طریقہ نہایت پسندیدہ ہے

تعمیہ | مادّہ پورے مصرعے میں ہو یا فقرے میں، لیکن اعداد جوڑنے میں کم ہو تو شاعر پہلے مصرعے میں ایک لفظ لکھ کر اس کا اشارہ کر دیتا ہے تاکہ وہ کمی پوری ہو جائے۔ اس عدد بڑھانے کا نام تعمیہ ہے۔

؎ سر اخلاص سے تاریخ ہے داغ   مزار اشرف عبدالنبی خاں

آخری مصرعے میں ۱۳۰۴ھ پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر نے پہلے مصرعے میں اشارہ کر دیا کہ "سر اخلاص" سے تاریخ کہو۔ سر اخلاص یعنی اخلاص کا پہلا حرف الف ہے۔ اس کا ایک عدد بڑھا دیا تو ۱۳۰۵ھ ہو گئے۔ اور یہی تاریخ مطلوب تھی۔

تخرجہ | مادّے کے مصرعے یا فقرے میں جب اعداد سن مطلوب سے کچھ زیادہ نکلتے ہوں اور شاعر اس کے گھٹانے سے معذور ہو تو مصرع اوّل میں ایک اشارہ کمی کا کر دیا جاتا ہے۔

اس کا نام تخرجہ ہے۔

؎ فرق حاسد کا کاٹ کر لکھو　　داغ کی معجز بیانی دیکھنا

اس میں ۸ عدد کا تخرجہ ہے۔

مومن نے شاہ عبدالعزیز کی وفات کی تاریخ کہی ہے:۔

دست بیدادِ اجل سے بے سروپا ہو گئے　　فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

مصرعۂ ثانی کے الفاظ کے سروپا (اول آخر) دور کرنے سے ق۔ ی۔ ض۔ ن۔ ط
۱۰۰ ۱۰ ۸۰۰ ۵۰ ۹

ر۔ ل۔ م حاصل ہوتے ہیں جن کے اعداد ۱۲۳۹ھ ہوئے۔
۲۰۰ ۳۰ ۴۰

چند مشاہیر شعرائے اردو کی تاریخہائے وفات

نام	تخلص	مورخ	مادہ ہائے تاریخ	سن
سید خواجہ میر	درد	نامعلوم	حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب	۱۱۹۹ھ
مرزا محمد رفیع	سودا	مصحفی	سودا کجا و آں سخن دل فریب او	۱۱۹۵ھ
میر محمد تقی	میر	ناسخ	واویلا مُرد شہ شاعراں	۱۲۲۵ھ
مرزا اسد اللہ خاں	غالب	نامعلوم	آہ غالب بمُرد	۱۲۸۵ھ
شیخ امام بخش	ناسخ	رشک	دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے	۱۲۵۴ھ
خواجہ حیدر علی	آتش	فوق	لکھنؤ میں نام آتش کر گئے	۱۲۶۳ھ
حکیم مومن خان	مومن	مومن	دست و بازو بشکست	۱۲۶۸ھ
میر ببر علی	انیس	نامعلوم	غم انیس میں ہے ہے۔ دیا دبیر کا غم	۱۲۹۱ھ
مرزا سلامت علی	دبیر	"	"	۱۲۹۲ھ
میر غلام حسن	حسن	مصحفی	شاعر شیریں بیاں۔ تاریخ یافت	۱۲۰۱ھ

نظم

نظم کے محاسن

شاعری کیا ہے؟ شاعری کی تعریف کرنا نہایت مشکل ہے مگر مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ جذبات کو مؤثر طور پر بیان کرنے کا نام شاعری ہے، شعر میں وزن کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ کلام موزوں کا نام شعر ہے۔ ردیف اور قوافی کا استعمال شعر کو اور زیادہ مؤثر بنا دیتا ہے۔

شاعری کے اہم اجزا (۱) شاعری کا ایک اہم جزو جذبات نگاری ہے۔ شاعر کے احساسات نہایت نازک ہوتے ہیں۔ وہ جب کسی جذبے سے متاثر ہوتا ہے تو اپنے جذبے کو الفاظ کے ذریعے ادا کر کے یہ چاہتا ہے کہ سامعین بھی اس جذبے سے متاثر ہوں، اس لئے کسی نظم کو پڑھ کر سامعین کے دلوں میں بھی شاعر کی طرح محبت، نفرت، خوشی، غم، حیرت، تعجب، اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

(۲) **تخئیل**:۔ شاعری کا دوسرا اہم جزو تخئیل ہے۔ شاعر صرف انھیں چیزوں کا بیان نہیں کرتا جنھیں حواس خمسہ کے ذریعے ہم محسوس کرتے ہیں، بلکہ وہ اپنی قوت متخیلہ سے کام لے کر غیر موجود اشیاء کو بھی ہماری نظر کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

ان کے علاوہ ایک اچھے شعر میں اور بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً شعر میں الفاظ کی موزونیت ہوتی ہے۔ بندش چست ہوتی ہے۔ بیان میں جدت ہوتی ہے۔ شعر میں الفاظ کے ذریعے کسی چیز کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ محاورات اور صنائع بدائع کا استعمال ہوتا ہے۔

لہٰذا کسی نظم کو پڑھتے وقت ہمیں یہ دیکھنا چاہئیے کہ اس نظم میں کن جذبات کو ادا کیا گیا ہے۔ وہ کون سے الفاظ ہیں جن سے ان جذبات کی ادائیگی میں مدد لی گئی ہے۔

اس لئے الفاظ اور محاورات کے معنی کا سمجھنا ضروری ہے۔

پھر یہ دیکھنا چاہیئے کہ شعر کی بندش کیسی ہے۔ اس میں کون کون سے محاورے استعمال کئے گئے ہیں اور کون کون سی صنعتیں استعمال کی گئی ہیں تاکہ ان اشعار سے ہم پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔

عام طور پر ہمارے اہل ادب نے شعر کی تقسیم بحر، وزن، قافیہ اور ردیف وغیرہ کے لحاظ سے یعنی باعتبار ہیئت کی ہے۔ اس لئے شاعری کی صرف چند محدود صنفیں پیدا ہوئیں جو درج ذیل ہیں:۔

(۱) غزل	(۱۰) مثمن
(۲) قصیدہ	(۱۱) متسع
(۳) قطعہ	(۱۲) معشر
(۴) مثنوی	(۱۳) رباعی
(۵) مثلث	(۱۴) ترکیب بند
(۶) مربع	(۱۵) ترجیع بند
(۷) مخمس	(۱۶) مستزاد
(۸) مسدس	(۱۷) معرّیٰ (آزاد نظم) یا بلینک ورکس
(۹) مسبّع	(۱۸) سائینٹ

غزل | لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا۔ اصطلاح میں اس نظم کا نام ہے جس میں عشق و محبت، حسن و جمال، وحشت و عشرت، یاس و امید، خوف و رجا، خزاں و بہار، شادی و غمی کے مضامین لکھے جائیں۔ یعنی غزل میں کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا۔ بلکہ جدا جدا خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کئے جاتے ہیں۔ غزل میں کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ (آج کل کے رواج کے مطابق) ۲۱ یا ۲۵ شعر ہوتے ہیں اور اس میں اشعار

کی تعداد ہمیشہ طاق ہوتی ہے۔

آج کل غزل میں فلسفۂ حیات انسانی، اور اخلاق آفریں، و زندگی آموز حقائق بھی نظم کئے جاتے ہیں۔ یعنی اب غزل میں تغزل کی بجائے تدبر زیادہ ہوتا ہے۔ اگر وہ پرواز اور رتبہ جو غزل کو اب ملا ہے نہ ملتا تو غزل کبھی کی مر چکی ہوتی۔

مثال

کوئی امید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ　　شرم تم کو مگر نہیں آتی　(غالب)

زمین غزل | غزل کی زمین سے ردیف، قافیہ اور بحر مراد ہے۔ اگر وہی ردیف و قافیہ دوسری بحر میں باندھ دیا جائے تو زمین دوسری ہو جائے گی۔

مثال

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا　　کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے　　یار کا دروازہ پائیں گر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ　　زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا
مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ　　رہروی میں پردۂ رہبر کھلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک　　آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

نامے کے ساتھ آگیا پیغام مرگ | رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا
دیکھیو غالبؔ سے گر الجھا کوئی | ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا (غالبؔ)

اوپر کی غزل بحر رمل میں ہے۔ اس بحر کا وزن یہ ہے:۔

فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن (چھ بار)

یہ بحر اور ردیف "کھلا" اور قافیہ در، گر، پر وغیرہ ان سب کے مجموعے کا نام زمین غزل ہے۔ اگر یہی ردیف "کھلا" اور قافیہ "در" وغیرہ اور بحر میں باندھا جائے تو زمین بدل جائے گی۔

مثال

بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا | رکھیو یارب یہ در گنجینۂ گوہر کھلا
شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا | اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا
گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید | پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا | جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم، ہے بلاؤں کا نزول | آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا
کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال | نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا
ان کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند | واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا (غالبؔ)

یہ غزل بھی بحر رمل میں ہے، لیکن اس بحر کا وزن یہ ہے:۔

فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن (۸ بار) اس لئے اس سے زمین غزل بدل جائے گی۔

ردیف | قافئے کے بعد جو ایک ہی لفظ یا الفاظ مستقل طور پر شعر میں آئیں انھیں ردیف کہتے ہیں۔

مثال

غم اٹھانے کے واسطے دم ہے | زندگی ہے اگر تو کیا غم ہے

آئے ہیں وہ رقیب کے گھر سے | اک خوشی ہے تو ایک ماتم ہے
کہتے ہو کچھ کہو، کہوں کیا خاک | جانتا ہوں مزاج برہم ہے
اک جہاں مہرباں ہوا تو کیا | مہربانی تری مقدم ہے
سنتے ہیں داغ کل وہ آئے تھے | بارے اب تو سلوک باہم ہے (داغ)

یا

آئے بھی تو وہ منہ کو چھپائے مرے آگے | اس طرح سے آئے کہ نہ آئے مرے آگے
کیا دم کا بھروسا ہے پھر آئے کہ نہ آئے | جانا ہو جو قاصد کو تو جائے مرے آگے
مانگی ہے دعا وصل کی کچھ اور نہ سمجھو | کوسا ہو اگر میں نے تو آئے مرے آگے
تیور یہی کہتے تھے کہ یہ نام ہے میرا | لکھ کر کوئی حرف اس نے مٹائے مرے آگے
کچھ داغ کا مذکور جو آیا تو وہ بولے | آئے تھے بُرا حال بنائے مرے آگے (داغ)

پہلی غزل میں "ہے" ایک لفظ ہے اور دوسری میں "مرے آگے" دو لفظ ہیں جو مستقل طور پر آخر تک آئے ہیں اور کہیں نہیں بدلے۔

قافیہ | ردیف سے پہلے جو ہم وزن لفظ یا الفاظ ہوتے ہیں اور ہر شعر میں بدل جاتے ہیں۔ وہ قافیہ کہلاتا ہے۔

مثال

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے | دل سے سب کچھ بُھلا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے | دلِ بے مُدّعا دیا تو نے
بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو | بے غرض جو دیا، دیا تو نے
جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی | اس سے مجھ کو سوا دیا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا | جو دیا اے خدا دیا تو نے (داغ)

ان اشعار میں "دیا تو نے" سے پہلے کا لفظ "پڑھا، بُھلا" وغیرہ قافیہ ہے جو

ہر شعر میں بدلتا گیا ہے۔

شعر | شعر کے لغوی معنی دریافتن یا دانستن (جاننا) کے ہیں۔ اصطلاح میں ایسے کلام موزوں کو کہتے ہیں جسے کہنے والے نے قصد اور ارادے سے کہا ہو۔ شعر کو بیت بھی کہتے ہیں۔

مثال

حال وہ کیا جو حشر میں نہ کہا بات وہ کیا جو وقت پر نہ ہوئی

فرد | لغت میں اس کے معنی اکیلے اور تنہا کے ہیں۔ اصطلاح میں اس شعر کو کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم وزن ہوں خواہ ان میں قافیہ ہو یا نہ ہو جیسے :-

قائم رہے حسن ان بُتوں کا ہے ان کی بھی عجب خدائی

اس بنا پر ہر شعر فرد کہا جائے گا۔ مگر ہر فرد شعر نہیں کہا جا سکتا۔

بعض کے نزدیک فرد غزل یا قصیدہ یا قطعہ کے ایک شعر کو کہتے ہیں۔ یعنی ان نظموں کا ہر شعر بجائے خود فرد ہے یا بیت۔

مصرع | مصرع کے لغوی معنی "دروازے کا ایک پٹ" کے ہیں۔ اصطلاح میں نصف شعر کو مصرع کہتے ہیں۔ جس طرح کواڑ کے دو پٹوں سے گھر کا دروازہ بنتا ہے اسی طرح دو مصرعوں سے ایک شعر بنتا ہے۔

مثال

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے چمن اُڑ گیا آندھیاں آتے آتے

یہ ایک شعر ہے جو دو مصرعوں سے بنا ہے۔ پہلا مصرع "مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے" ہے اور دوسرا مصرع "چمن اُڑ گیا، آندھیاں آتے آتے"۔

مطلع | غزل وغیرہ کے پہلے شعر کو جس کے دونوں مصرعوں میں ردیف و قافیہ ہوتا ہے۔ مطلع کہتے ہیں۔ باقی اشعار میں دونوں مصرعوں کا ہم قافیہ اور ہم ردیف ہونا ضروری نہیں

بلکہ صرف ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں وہی ردیف اور وہی قافیہ لایا جاتا ہے جو غزل کے مطلعے میں استعمال ہوا ہے۔

مثال

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی — آپ سے تم، تم سے تو ہونے لگی

حسن مطلع یا زیب مطلع | جو شعر مطلع کے بعد واقع ہو اسے حسن مطلع یا زیب مطلع کہتے ہیں وہ مطلعے کی طرح ہم قافیہ اور ہم ردیف ہو یا نہ ہو۔

مثال

نکل جائے یہ حسرت وہ نہیں ہے — بدل جائے یہ قسمت وہ نہیں ہے
وہی تم ہو طبیعت وہ نہیں ہے — وہی صورت ہے سیرت وہ نہیں ہے

یہ پہلا شعر مطلع ہے اور دوسرا شعر حسن مطلع یا زیب مطلع ہے جو مطلعے کی طرح ہم قافیہ اور ہم ردیف بھی ہے۔

یا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا — جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
دل لے کے مفت، کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں — اُلٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

اس میں دوسرا شعر حسن مطلع یا زیب مطلع ہے جو مطلعے کی طرح ہم قافیہ اور ہم ردیف نہیں ہے۔

مقطع | غزل کے سب سے آخری شعر جس میں شاعر عام طور پر اپنا تخلص لاتے ہیں مقطع کہلاتا ہے۔ تخلص اگر مطلع میں بھی آجائے تو جائز ہے۔

آخری شعر میں تخلص کا استعمال

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ — ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے
اللہ اللہ رے تری شوخ بیانی اے داغ — سُست اک شعر نہ دیکھا ترے دیواں میں کبھی

مطلع میں تخلص کا استعمال

کس نے کہا کہ داغ وفادار مر گیا — وہ ہاتھ مل کے کہتے ہیں کیا یار مر گیا

داغ اس بزم میں مہمان کہا جاتا ہے — تیرا اللہ نگہبان کہاں جاتا ہے

بیت الغزل | غزل کا بہترین شعر بیت الغزل کہلاتا ہے۔ جیسے غالب کی اس غزل :-

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

کا یہ شعر ؎

نینداس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اسکی ہیں — تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

یا

جیسے داغ کی اس غزل :-

مجھے اے اہلِ کعبہ یاد کیا میخانہ آتا ہے — اِدھر دیوانہ جاتا ہے اُدھر مستانہ آتا ہے

کا یہ شعر ؎

رُخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں — اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

شاہ بیت | قصیدے کا بہترین شعر شاہ بیت کہلاتا ہے۔ جیسے غالب کے اس قصیدے

صبح دم دروازۂ خاور کھلا — مہر عالم تاب کا منظر کھلا

کا یہ شعر ؎

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید — کِس نے کھولا، کب کھُلا، کیوں کر کھُلا

قصیدہ | قصیدے کے لغوی معنی مغز کے ہیں۔ چونکہ قصیدے میں ایسے معنی جلیلہ بیان کئے جاتے ہیں جو مذاق سلیم پسند کرتا ہے۔ اس لئے اس قسم کو قصیدہ کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قصیدہ عربی لفظ قصد سے مشتق ہے جس کے معنی ارادے کے ہیں۔ چونکہ قصیدہ لکھتے وقت شاعر کا ارادہ ممدوح کی تعریف کا ہوتا ہے اس لئے اس قسم کی نظم کو قصیدہ کہتے ہیں۔

اصطلاح شاعری میں اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی تعریف یا بُرائی بیان کی جائے۔

پہلے شعر کے دونوں مصرعے باقی اشعار کے ثانی مصرعوں سے ہم قافیہ ہوں۔ قصیدے میں پندرہ اشعار سے کم نہیں ہوتے اور زیادہ کی حد نہیں۔ قصیدہ اپنی ردیف یا قافیہ یا مضمون کے لحاظ سے موسوم ہوتا ہے۔ اگر قافیے میں لام ہے تو قصیدہ لامیہ کہلائے گا۔ آفتاب ردیف ہے تو شمسیہ، بہار کا ذکر ہے تو بہاریہ، اپنی تعریف ہے تو فخریہ۔ اس کے علاوہ عشقیہ وغیرہ۔

قصیدے کے چار حصّے ہوتے ہیں۔ ابتدائی حصّہ جو بطور تمہید ہوتا ہے۔ اس کو اصطلاح میں تشبیب کہتے ہیں۔ تشبیب کے بعد جب ممدوح کی تعریف شروع کی جاتی ہے تو اس کو اصطلاح میں مخلص یا گریز کہتے ہیں۔ پھر مدعا اور آخر میں دعا ہوتی ہے۔ جس میں یہ چار حصّے نہ ہوں وہ قصیدہ ناتمام ہوتا ہے۔ قصیدے کے بھی پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں اور بہترین شعر شاہ بیت کہلاتا ہے۔ قصیدے میں جہاں جہاں مضمون بدلتا جاتا ہے نیا مطلع نئی تمہید کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ اس طرح ایک قصیدے میں چار چار مطلعے ہوتے ہیں۔ اشعار میں ردیف، قافیہ اور وزن کی قید غزل جیسی ہے۔ ہاں غزل کے لئے سادہ اور صاف زبان کی قید ہے، مگر اس کے برخلاف قصیدے میں شوکت الفاظ کی شان زیادہ دکھائی جاتی ہے۔

مثال

مدح بہادر شاہ ظفر

صبح دم دروازۂ خاور کھلا — مہرِ عالم تاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں — شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود — صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر — اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر — بادۂ گل رنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساقی نے صبوحی کے لیئے — رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ امن و اماں کا در کھلا
تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا — خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا
شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے — رازِ ہستی اُس پہ سر تا سر کھلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں — مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے — عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام — اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا
توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب — ق — تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب — تو کہے بُت خانۂ آذر کھلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کی — منصبِ مہر و مہ و محور کھلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید — کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک — میری حدِ وسع سے باہر کھلا
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار — مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا چرخ چکّر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
سکّۂ شہ کا ہوا ہے روشناس — اب عیارِ آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ — اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا

فکر اچھی پر ستائش ناتمام — عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا
تم کرو صاحبقرانی جب تلک — ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

پہلے شعر سے آٹھویں شعر تک تشبیب ہے۔ نویں شعر سے گریز شروع ہے۔ تیسواں شعر مدعا ہے اور اکتیسواں دعا۔

قطعہ لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں۔ اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں جس کے آخری تمام مصرعوں میں قافیہ ہو اور پہلے کسی مصرعے میں قافیہ نہ ہو۔ اسی لئے اس میں مطلع نہیں ہوتا۔ قطعے کا مضمون مسلسل ہوتا ہے۔ اس میں کم سے کم دو شعر ہوتے ہیں۔ زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ قطعات میں اکثر پند و نصائح کے مضمون بیان کئے جاتے ہیں۔

بعض دفعہ شاعر غزل میں بھی دو یا تین شعروں میں مطلب ادا کرتے ہیں ایسے اشعار مسلسل پڑھنے سے مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ علامت کے طور پر ان کے شروع میں قؔ لکھ دیتے ہیں اور یہ قطع کا مخفف سمجھا جاتا ہے۔

مثال

مرقعِ عبرت

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل! — زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — وہ جنتِ نگاہ، یہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے (غالب)

کم سے کم دو شعر والے قطع کی مثال

جب کہا میں نے کہ تم بیداد گر ناآشنا | بے مروت، بے وفا، بیگانۂ احباب ہو
ہنس کے فرمایا کہ میں تو خیر جو کچھ ہوں سو ہوں | تم بھی تو بے چین ہو، بے صبر ہو، بے تاب ہو (مومن)

دیگر

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو | اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو | روزہ اگر نہ کھائے تو مجبور کیا کرے (غالب)

غزل کے قطعہ بند اشعار کی مثال

تو سنِ شعر میں ہے وہ خوبی کہ جب ق | تھان سے وہ غیرت صرصر کھلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب | تو کہے بُت خانۂ آذر کھلا

مثنوی | مثنوی لفظ مثنیٰ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی دو دو کے ہیں۔ اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور مختلف اشعار کے مختلف قافیے ہوں، یعنی ہر شعر قافیے کے لحاظ سے دوسرے شعر سے جدا ہو۔ مضمون سلسلہ وار ہو، اشعار کی تعداد معیّن نہیں۔ سینکڑوں سے ہزاروں تک ہو سکتی ہے۔

یہ صنفِ نظم رزم و بزم، حسن و عشق اور افسانہ نگاری کے لئے مخصوص ہے، اور اس قسم کی واقعہ نگاری کے لئے مثنوی موزوں بھی ہے۔ کیوں کہ شاعر کو ایک ہی قسم کے ہم قافیہ اور ہم ردیف اشعار کی تلاش میں کاوش نہیں کرنی پڑتی۔ تمہید، توحید اور مناجات کا ہونا ابتدائے مثنوی میں ضروری ہے۔ مثنوی میں تمام اشعار کا وزن بھی ایک ہونا چاہیئے۔

فارسی زبان میں "شاہنامہ" اور مثنوی "مولانا روم" بہت مشہور ہے۔ اردو میں میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اور نسیم لکھنوی کی مثنوی "گلزار نسیم" کو بہت شہرت حاصل ہے۔

مثال

شاہ زادۂ بے نظیر کی ولادت

خوشی سے پلا مجھ کو ساقی شراب — کوئی دن میں بجتا ہے چنگ و رباب

کروں نغمۂ تہنیت کو شروع — کہ اک نیک اختر کرے ہے طلوع

عجب صاحبِ حسن پیدا ہوا — جسے مہر و مہ دیکھ شیدا ہوا

نظر کو نہ ہو حسن پر اس کے تاب — اُسے دیکھ بے تاب ہو آفتاب

ہوا وہ جو اس شکل سے دل پذیر — رکھا نام اُس کا شہِ بے نظیر

خواصوں نے خواجہ سراؤں نے جا — کئی نذریں گذرانیاں اور کہا

مبارک تجھے اے شہِ نیک بخت — کہ پیدا ہوا وارثِ تاج و تخت

سکندر نژاد اور دارا حشم — فلک مرتبت اور عطارد رقم

رہے اُس کے، اقلیم زیر نگیں — غلامی کریں اُس کی خاقان چین

یہ سنتے ہی مژدہ بچھا جا نماز — کئے لاکھ سجدے کہ اے بے نیاز!

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار — نہ ہو تجھ سے مایوس اُمیدوار

دوگانہ غرض شکر کا کر ادا — تہیا کیا شاہ نے جشن کا

وہ نذریں خواصوں کی خوجوں کی لے — انھیں خلعت و زر کا انعام دے

نقیبوں کو بلوا کے یہ کہہ دیا — کہ نقار خانے میں دو حکم جا

کہ نوبت خوشی کی بجادیں تمام — خبر سن کے یہ شاد ہوں خاص و عام

نئے سر سے عالم کو عشرت ہوئی — کہ لڑکے کے ہونے کی نوبت ہوئی

محل سے لگا تا بہ دیوانِ عام — عجب طرح کا اک ہوا ازدحام

چلے دینے نذریں امیر و وزیر — لگے کھینچنے زر کے تودے فقیر

دئے شاہ نے شاہزادے کے ناؤں — مشائخ کو اور پیرزادوں کو گاؤں

امیروں کو جاگیر، لشکر کو زر | وزیروں کو الماس، لعل و گہر
خواصوں کو خوجوں کو جوڑے دئے | پیادے جو تھے ان کو گھوڑے دئے
خوشی سے کیا یاں تلک زر نثار | جسے ایک دینا تھا بخشے ہزار (سحرالبیان)

مثلث: لغوی معنی تکونیہ۔ اصطلاح میں وہ نظم جس میں تین مصرعے ہوں۔ پہلے دو مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ اس کو تکڑ بھی کہتے ہیں۔

مثال

ہوائی جہاز

اے پرندِ مغربی ہوتا ہے جب تو پرفشاں | تنگ ہو جاتا ہے میدانِ فضائے آسماں
دیکھتے ہیں ٹکٹکی باندھے تجھے اہلِ جہاں

اے ہوا میں اڑنے والے اے پری پیکر جہاز | اے فضا کے طائرِ بے بال خوش منظر جہاز
ہاں دکھا دے آج چل کے مجھ کو سیرِ آسماں

ذہن کو سکتہ ہے تیری قوتِ پرواز پر | عقل کو حیرت ہے تیری طاقتِ پرواز پر
بے پر و بال اور اس حد کی سبک پروازیاں

یوں اڑیں گے وہم بھی ہوتا نہ تھا اس باب میں | بچپنے میں ہاں اڑا کرتے تھے لیکن خواب میں
آج دکھلایا ہے بیداری میں تو نے یہ سماں

جو کہ ہیں پستی کے ساکن آج ہیں رفعت نصیب | عالمِ بالا کے منظر ہوتے جاتے ہیں قریب
جا رہے ہیں چین سے بیٹھے سرِ تختِ رواں

جز فضا ملتا نہیں ہے اب کسی شے کا اثر | آسماں جس کو سمجھتے تھے وہ ہے حدِ نظر
تو ہی تو ہے صرف مابین زمین و آسماں

مائلِ اوج ترقی ہے ترا پیکِ خیال | تو نے آساں کر کے دکھلایا ہر اک کارِ محال
کون سی قوت بتا دے تیرے دل میں ہے نہاں

کوئی قوت روک لے تجھ کو بہت دشوار ہے — دل ہوا کا تو نے برمایا ہے وہ رفتار ہے

اُس کی قدرت ہے یہ نظارے کہاں اور ہم کہاں

تجھ سے ظاہر ہوگئی اس عصر کی دانشوری — قوت سائنس تیرے پُرزے پُرزے میں بھری

عقل کا اصلی مرقع علم کا اصلی نشان

جا رہا ہے تو بلندی پر غبارے کی طرح — چڑھ رہا ہے موسم گرما کے پارے کی طرح

قابلِ نظارہ ہے تیری ترقی کا سماں — (عزیز لکھنوی)

مربّع | لغوی معنی چوکور۔ اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں جس کے چار مصرعے ہوں۔ اور چاروں ہم وزن اور ہم قافیہ ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہر بند کا چوتھا مصرع پہلے بند کے آخری مصرع سے ہم قافیہ ہوتا ہے۔

مثال

دربارِ دہلی

سر میں شوق کا سودا دیکھا — دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا — کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا — اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا — حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

پلٹن اور رسالے دیکھے — گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے — بینڈ بجانے والے دیکھے

کچھ چہروں پر مردی دیکھی — کچھ چہروں پر زردی دیکھی

اچھی خاصی سردی دیکھی　　دل نے جو حالت کردی دیکھی

اچّھے اچّھوں کو بھٹکا دیکھا　　بھیڑ ہیں کھاتے جھٹکا دیکھا
منھ کو اگرچہ لٹکا دیکھا　　دل دربار سے اٹکا دیکھا

ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم　　ان کا چلنا کم کم تھم تھم
زریں جھولیں نور کا عالم　　میلوں تک وہ چم چم چم چم

پُر تھا پہلوئے مسجد جامع　　روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع　　سب کے سب تھے دید کے طامع

سُرخی سڑک پہ کُٹتی دیکھی　　سانس بھی بھیڑ میں گھُٹتی دیکھی
آتشبازی چُھٹتی دیکھی　　مُفت کی دولت لُٹتی دیکھی

اوجِ برٹش راج کا دیکھا　　پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا　　رُخ کرزن مہراج کا دیکھا

اوجِ بخت ملاقی ان کا　　چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا　　آنکھیں میری باقی ان کا

مثالِ دیگر

بھونرے کی بے قراری

نہ وہ کیتکی کی پھبن رہی　　نہ وہ موتیا کی ادا رہی

نہ وہ نسترن نہ سمن رہی — نہ وہ گل رہے نہ فضا رہی
نہ گلوں کے اب وہ ہیں قہقہے — نہ وہ بلبلوں کے ہیں چہچہے
نہ غزل سرا وہ لوے رہے — نہ وہ قمریوں کی صدا رہی
نہ وہ سرو ہے نہ وہ آبِ جو — نہ وہ ہم صفیر ہیں خوش گلو
نہ بنفشہ ہے نہ وہ ناز بو — نہ وہ جعفری وہ حنا رہی
نہ وہ صبح کی ہیں تجلّیاں — نہ شفق کی آہ وہ جھلکیاں
نہ وہ اودی اودی ہیں بدلیاں — نہ وہ بھینی بھینی ہوا رہی
نہ امنگیں ہیں وہ شباب کی — نہ وہ پتّیاں ہیں گلاب کی
نہ ہوا میں بُو ہے شراب کی — مجھے مست تھی جو بنا رہی
وہ کنول غضب کے تھے دل رُبا — وہ جو اڑتے تھے مرے ہم نوا
مگر اب نہ اُن کی ہے وہ ادا — نہ وہ نُور ہی نہ صفا رہی
لبِ آب جو تھی فضا غضب — وہ بہار کی تھی ہوا عجب
مرے کُنج میں جسے روز و شب — مئے بےخودی تھی پلا رہی
وہ غضب کی کوا کو، وہ زمزمہ — وہ سُریلی درد بھری صدا
سرِ شام سرو پہ فاختہ — مجھے لوریاں تھی سُنا رہی
ہیں کنول کی خشک جو پتّیاں — مری خواب گہ تھی کبھی یہاں
یہیں شب کو دے دے کے تھپکیاں — تھی نسیم مجھ کو سُلا رہی
یہاں گُل شگفتہ تھے جابجا — یہاں ننّھا ڈیزی تھا ہنس رہا
یہاں مسکراتی تھی موتیا — یہاں چمپا ادا تھی دکھا رہی
نہ کنول میں بوئے وفا رہی — نہ وہ دل فروز ادا رہی
نہ چمن رہا نہ فضا رہی — نہ وہ دن رہے نہ ہوا رہی

نہ روِش ہے اب وہ سپہر کی　　　نہ گلوں میں بو ہے وہ مہر کی
کہ ہوا ہے گلشن دہر کی　　　مجھے سبز باغ دکھا رہی (سرور جہاں آبادی)

مخمّس لغوی معنی وہ چیز جس میں پانچ پہلو ہوں۔ خمس عربی میں پانچ کو کہتے ہیں۔ اس مناسبت سے پانچ مصرعوں والی نظم کو مخمّس یا خمسہ یا تخمیس کہتے ہیں۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ کسی ایک شعر پر تین مصرعے کہے جاتے ہیں اور وہ تینوں مصرعے اسی شعر کے مضمون سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ اس کے ہر بند کا پانچواں مصرع پہلے بند کے آخری مصرعے کا ہم قافیہ ہوتا ہے۔

مثال

بچپن کی یاد

تیرے ایاغ کا ہوں میں جرعہ واز بچپن　　　باقی ہے تیری مے کا اب تک خمار بچپن
تیرے فراق میں ہوں میں بیقرار بچپن　　　کروں گلے لگا کر آ تجھ کو پیار بچپن
کیوں مجھ سے روٹھ بیٹھا تیرے نثار بچپن

پھر خاک کا گھروندا آنگن میں میں بنالوں　　　چھوٹی سی اپنی کشتی پانی میں پھر بہالوں
طفلی کے پیارے پیارے معصوم گیت گالوں　　　پھر بانسری بجالوں پھر جھنجھنا بجالوں
دو دن کو اے جوانی دے دے ادھار بچپن

تونے کئے جوانی طفلی کے کیا کھلونے　　　وہ میرے ننھے ننھے تکیں فزا کھلونے
میں جن سے کھیلتا تھا وہ دلربا کھلونے　　　لادے کہیں سے مجھ کو وہ خوشنما کھلونے
اِن پیاری مورتوں کو ہوں بیقرار بچپن

پیارا تھا باپ کا میں اور ماں کا لاڈلا تھا　　　گھر بھر میں پھول گویا میں گلاب کا تھا
صورت بھی دلربا تھی چہرہ بھی خوشنما تھا　　　وہ ننھے ننھے تلوے وہ ابھرا ابھرا ماتھا
بھولے نہیں وہ تیرے نقش و نگار بچپن

پھولوں کا وہ مہکنا کلیوں کا وہ چٹکنا　　سبزے کا وہ لہکنا شاخوں کا وہ لچکنا
چڑیوں کا وہ پھدکنا قمری کا وہ چہکنا　　وہ رعد کا کڑکنا بجلی کا وہ چمکنا
وہ ٹھنڈی ٹھنڈی جھڑیاں اور وہ پھوار بچپن

کیچڑ میں وہ پھسل کر گلیوں میں لوٹ جانا　　اور میرے ہمسنوں کا وہ قہقہے لگانا
شانہ پکڑ کے میرا آہستہ پھر اٹھانا　　لت پت وہ گھر کا آنا وہ ماں کا مسکرانا
کُرتا نیا بدل کر کرنا وہ پیار بچپن

آ! عمر رفتہ آکر مجھ کو گلے لگالے　　آ! اے شباب میری طفلی کے ناز اٹھالے
عمر رواں نے تجھ کو کس کے کیا حوالے　　پایا نشاں نہ تیرا او چھپ کے جانے والے
کھویا گیا کہاں تو تیرے نثار بچپن

دایہ کے دوش، ماں کی آغوش سے جدا ہوں　　سڑکوں پہ خاک اڑاتا گلیوں میں لوٹتا ہوں
طفلی کی آرزوؤ! تم سے بچھڑ گیا ہوں　　ان پیاری لوریوں کو کب سے ترس رہا ہوں
لے لے شباب۔ دے دے پروردگار بچپن

مسدس لغوی معنی وہ چیز جس میں چھ پہل ہوں۔ عربی میں چھ کو مسدس کہتے ہیں۔ اس مناسبت سے اصطلاح شاعری میں اس نظم کو مسدس کہتے ہیں جس میں چھ چھ مصرعوں کا ایک ایک بند ہوتا ہے۔ پہلے چار مصرعوں کا ایک قافیہ ہوتا ہے اور آخر کے دو مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ دونوں مصرعے گرہ یا ٹیپ کا شعر کہلاتے ہیں اور شعرا اپنا زورِ کلام زیادہ تر اسی میں دکھاتے ہیں۔ مسبع سات مصرعوں، مثمن آٹھ مصرعوں کا، متسع نو مصرعوں کا اور معشر دس مصرعوں کا طریق مذکورہ کے مطابق ہوتا ہے۔

مثال مسدس

فراق یوسفؑ میں یعقوبؑ کی بے چینی

یوسفؑ کو عزیزوں نے چھڑایا جو پدر سے　　فرقت ہوئی یعقوبؑ کو اس رشکِ قمر سے

رنگِ رُخ پر نور اُڑا درد جگر سے　　دنیا ہوئی اندھیر چھپا چاند نظر سے
دل آب ہوا جاتا تھا فرزند کے غم میں
بیٹا تو کنوئیں میں تھا پدر چاہ الم میں

تھا چشم کے چشموں سے رواں اشک کا سیلاب　　برمیں دل مجروح طپاں صورت سیماب
آرام کی صورت نہ کوئی زیست کا اسباب　　فرزند جب آنکھوں سے نہاں ہو تو کہاں تاب
بستر کو کبھی دیکھ کے دل بند کے روتے
تکیوں سے لپٹ کر کبھی فرزند کے رہتے

پیراہنِ یوسف کبھی آنکھوں سے لگاتے　　کُرتے کی کبھی سونگھ کے بو، اشک بہاتے
رو رو کے یہ فرماتے جو کپڑے نظر آتے　　پوشاک یہ جس کی ہے اُسے ہم نہیں پاتے
افسوس کہ وہ خلق سے بن باپ سدھارے
کپڑے تو دھرے رہ گئے اور آپ سدھارے

جاتے تھے عصا تھامے ہوئے شہر میں گھر گھر　　بیٹے سے ملاقات نہ ہوتی تھی میسّر
جو راہ میں ملتا تھا تو یہ کہتے تھے رو کر　　ملتا نہیں گم ہوگیا یوسف مرا دلبر
اب جان نکلتی ہے جِلا دے مجھے کوئی
فرزند سے لِلّٰہ ملا دے مجھے کوئی　　(انیسؔ)

مثالِ سبع

فراقِ یار

افسوس اس چمن میں وہ سروِ رواں نہیں　　لطفِ بہار، تازگیٔ گلستاں نہیں
ایسا کوئی چمن نہیں جس میں خزاں نہیں　　گُل خندہ زن نہیں کہ وہ آرامِ جاں نہیں
سنبل میں بوئے کاکلِ عنبر فشاں نہیں　　بُلبُل کا شاخِ گُل پہ کوئی آشیاں نہیں
وہ چہچہا نہیں ہے وہ شور و فغاں نہیں

سر پہ اُڑاتی خاک ہے بادِ سحر کہیں
شبنم سرِ اشک گرم سے ہے چشم تر کہیں
پتھر پہ باغبان پٹکتا ہے سر کہیں
بُلبُل کا آشیاں ہے کہیں بال و پر کہیں
لالہ سے آشکار ہے داغِ جگر کہیں
خالی نہیں ہے درد و مصیبت سے گھر کہیں
دل میں جگر میں آنکھ میں سر میں کہاں نہیں
(مولوی غلام امام شہید)

مثالِ مثمن

نسیم سحر

ہنگامِ صبح ناز سے بادِ صبا چلی
ہر چار سمت باغ میں کلیاں کھلا چلی
جس پھول کے قریب سے گذری ہنسا چلی
سبزہ جو خواب میں تھا اُسے بھی جگا چلی
کلیوں سے چھیڑ کرتی چلی گدگدا چلی
ہر گُل سے کھیلتی ہوئی با صد ادا چلی
پودوں نے گود میں جو لیا تو پلٹ چلی
شرمائی اور لجائی، کٹی اور سمٹ چلی

اک سانس لے کے پھر روشوں سے گذر چلی
بے خوف بے ہراس چلی بے خطر چلی
دامن ہزار طرح سے خوشبو سے بھر چلی
شبنم سے چھو کے بھیگ گئی تر بتر چلی
غنچوں کو چھیڑ چھیڑ کے شرمندہ کر چلی
کس ڈھنگ سے چمن میں نسیمِ سحر چلی
اک کنج میں جو پہنچی تو چکرا کے رہ گئی
بل تو بہت سے کھائے پہ بل کھا کے رہ گئی

پھر کنج سے نکل کے بہت ناتواں چلی
اور خشک پتّیوں کا لئے کارواں چلی
کچھ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھرے نیم جاں چلی
بیرونِ باغ صورتِ عمر رواں چلی
خاک اس قدر اڑی کہ بہت ہی گراں چلی
یہ کون جانتا ہے چمن سے کہاں چلی
افسرؔ صبا ہر ایک کو مسرور کر گئی
کیفیتوں سے روح کو معمور کر گئی
(حامد اللہ افسر)

مثال متسع

نعت سرور کائنات

تصدّق ترے نورِ ذات قدیم — حبیب خدائے غفور و رحیم
عطا پاش و شافع جواد و کریم — خطا پوش و ستار راز اثیم
معطر کُن جامہ ہائے نسیم — معنبر نمائے ادائے شمیم
شرافت دہِ قصر عرشِ عظیم — طرب بخش کیف طوافِ حریم
ادا فہم رمز الف لام میم

تصدّق ترے مہ رخ و مہ لقا — تصدّق ترے مہر اوج علا
تصدّق ترے ہادیٔ اولیا — تصدّق ترے اشرف الانبیا
تصدّق ترے شاہ ہر دو سرا — تصدّق ترے غرق بحرِ فنا
تصدّق ترے دُرّ بحر بقا — تصدّق ترے محو ذات خدا
ادا فہم رمز الف لام میم

کرم ہو گا خادم پہ کب تک شہا — ملے کب دلی شوق کا مدعا
کچھ اس ابتدا کی بھی ہے انتہا — پریشاں ہے دل اور حیرت ادا
نہ تسکیں کی صورت نہ کیف آشنا — نہ ہمدم تسلّی نہ محرم فضا
عجب کشمکش میں ہے عاجز ضیاؔ — عجب طرح کٹتی ہے صبح و مسا
ادا فہم رمز الف لام میم (ضیاؔ)

مثال معشّر

زندگی نغمۂ روحانی ہے

نہ حبابوں کی طرح فانی ہے — نہ سمندر کی یہ طغیانی ہے
نہ یہ جذبات کی سیلانی ہے — نہ یہ نکہت کی پریشانی ہے

نہ یہ خورشید کی تابانی ہے نہ یہ ظلمت کی فراوانی ہے
نہ یہ اِک جذبۂ نفسانی ہے مقصد اس کا نہ ہوس رانی ہے

زندگی مرکزِ رُوحانی ہے!
زندگی نغمۂ لافانی ہے!

ابدی گلشنِ عشرت ہے یہی! ازلی نغمۂ فطرت ہے یہی!
مظہرِ جلوۂ وحدت ہے یہی! کُنتُ کنزاً کی حقیقت ہے یہی
مستیٔ بادۂ الفت ہے یہی! نغمۂ سازِ محبّت ہے یہی!
حسنِ لافانیٔ جنّت ہے یہی! مرکزیِ چشمۂ رحمت ہے یہی!

زندگی مرکزِ روحانی ہے!
زندگی نغمۂ لافانی ہے!

ذرّہ ذرّہ ہے جہاں کا باسود عمر اس کی ہے یقیناً محدود
رازِ فطرت ہے مگر بزمِ شہود نہیں بے وجہ عدم اور موجود
غایتِ خلق نہ سمجھو مفقود زیست اپنی ہے سراسر مقصود
جسم تک مسئلہ بود و نبود! اللہ اللہ یہ خیال محدود!

زندگی مرکزِ روحانی ہے!
زندگی نغمۂ لافانی ہے!

دیکھ ہاں دیکھ نشیب اور فراز! سازِ ہستی میں ہے، کس کی آواز؟
کس کے نغمے ہیں مگر سمع نواز؟ تیری آنکھوں میں ہے کس کا اعجاز؟
جلوۂ حسن میں کس کا انداز؟ اور غمِ عشق ہے کیوں روح نواز؟
او پرستارِ خودی، بندۂ آز! عقل پر اپنی تجھے اتنا ناز!

زندگی مرکزِ روحانی ہے!

زندگی نغمۂ لافانی ہے! (نکہت شاہجہانپوری)

رباعی عربی میں ربع چار کو کہتے ہیں۔ اس وجہ سے چار مصرعوں والی نظم کو رباعی کہا جاتا ہے۔ اس میں دو شعر ہوتے ہیں، اور تیسرے مصرع میں کوئی قافیہ نہیں ہوتا۔ رباعی کا چوتھا مصرع پہلے تین مصرعوں سے زیادہ اچھا اور برجستہ ہوتا ہے۔ کیونکہ سننے والوں پر مضمون کی چستی اور نصیحت کا اثر اس آخری مصرع سے پڑتا ہے۔

رباعی ایک خاص وزن میں کہی جاتی ہے۔ قطعہ، قصیدہ اور غزل کی طرح ہر وزن میں نہیں کہی جاتی۔ رباعی کا آسان وزن "لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ" ہے۔ جو نظم اس وزن پر ہو وہ رباعی ہے۔ ورنہ قطعہ وغیرہ۔ اگر اس جملے کے وزن پر عبور پا لیا جائے تو رباعی کے عام وزن پر قدرت حاصل ہو سکتی ہے۔ رباعی میں عموماً اخلاقی اور اصلاحی مضمون نظم کئے جاتے ہیں۔

مثال

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں　　آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن　　خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں (غالبؔ)

دیگر

جس کو کوئی مرتبہ خدا دیتا ہے　　وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی　　جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے (انیسؔ)

دیگر

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا　　ہم کیا ہیں کوئی کام جو ہم سے ہوگا
جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے　　جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا (ذوقؔ)

ترکیب بند اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے کئی حصے ہوتے ہیں۔ ہر حصے میں شاعر چند ہم قافیہ شعر کہہ کر آخری شعر کو دوسرے قافیے پر ختم کرتا ہے۔ اُس آخری شعر کو گرہ یا ٹیپ

کی بیت کہتے ہیں۔ یہ گرہ اور اوپر کے ہم قافیہ شعر کا حصّہ مل کر ایک بند کہا جاتا ہے۔ اسی طرح چند حصّے ہوتے ہیں۔ ہر بند کے قافئے ایک دوسرے سے جُدا جُدا ہوتے ہیں۔

مثال

چُپ کی داد

اے ماؤ۔ بہنو۔ بیٹیو! دُنیا کی زینت تم سے ہے
مُلکوں کی بستی ہو تمھیں قوموں کی عزت تم سے ہے

تم گھر کی ہو شہزادیاں شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دِلوں کی شادیاں دُکھ سُکھ میں راحت تم سے ہے

تم ہو تو غربت ہے وطن۔ تم بن ہے ویرانہ چمن
ہو دیس یا پردیس جینے کی حلاوت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو۔ عفّت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں۔ ایماں سلامت تم سے ہے

فطرت تمھاری ہے حیا۔ طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹّی میں ہے صبر و رضا۔ انساں عبارت تم سے ہے

مونس ہو خاوندوں کی تم۔ غم خوار فرزندوں کی تم
تم بن ہے گھر ویران سب گھر بھر میں دولت تم سے ہے

تم آس ہو بیمار کی۔ ڈھارس ہو تم بیکار کی
دولت ہو تم نادار کی عسرت میں عشرت تم سے ہے

آتی ہو اکثر بے طلب دُنیا میں جب آتی ہو تم
پر موہنی سے اپنی یاں گھر بھر پہ چھا جاتی ہو تم
میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم

پر سارے کنبے کی رہیں بچپن سے خدمت گار تم
ماں باپ کے حکموں پہ پُتلی کی طرح پھرتی رہیں
غم خوار باپوں کی رہیں۔ ماؤں کی تابع دار تم
دن بھر پکانا ریندھنا سینا پرونا ٹانکنا
بیٹھیں نہ گھر پر باپ کے خالی کبھی زنہار تم
راتوں کو چھوٹے بھائی بہنوں کی خبر اُٹھ اُٹھ کے لی
بچہ کوئی سوتے میں رویا اور ہوئیں بیدار تم
سُسرال میں پہونچیں تو واں، ایک دوسرا دیکھا جہاں
جا اُتریں گویا دیس سے پردیس میں اک بار تم
واں فکر تھی ہر دم یہی ناخوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ واں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر، سُسرے کا دل مَیلا نہ ہو
آنکھوں میں ساس اور نند کی کھٹکو نہ مثلِ خار تم
غم کو غلط کرتی رہو سُسرال میں ہنس بول کر
شربت کے گھونٹوں کی طرح پیتی رہو خونِ جگر
شادی کے بعد ایک ایک کو تھی آرزو اولاد کی
تم پھنس گئیں جنجال میں خالق نے جب اولاد دی
دردوں کے دُکھ تم نے سہے جاپے کی جھیلیں سختیاں
جب موت کا چکھا مزا تب تم کو یہ دولت ملی
مَیکے میں اور سُسرال میں سب کے ہوئے دل باغ باغ
گھر میں اُجالا تو ہوا۔ پر تم پہ بپتا پڑ گئی

کھانا پہننا اوڑھنا اپنا گئیں سب بھول تم
بچّوں کے دھندے میں تمھیں اپنی نہ کچھ سُدھ بُدھ رہی
تب تک بھی سمجھو خیر تھی جب تک بھلے چنگے تھے سب
پر سامنا آفت کا تھا گر ہو گیا ماندا کوئی
سولی پہ دن کٹنے لگے راتوں کو نیندیں اڑ گئیں
اک اک برس کی ہو گئی ایک ایک پل اک اک گھڑی
بچّوں کی سیوا میں تمھیں گزرے ہیں جیسے دس برس
قدر اس کی جانے گا وہی دم پر ہو یوں جس کے بنی
کی ہے مُہم جو تم نے سر مَردوں کو اس کی کیا خبر
جانے پرائی پیڑ وہ جس کی بوائی ہو پھٹی
تھا پالنا اولاد کا مَردوں کے بُوتے سے سوا
آخر یہ اے دُکھیاریو! خدمت تمھارے سر پڑی
پیدا اگر ہوتیں نہ تم. بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اُٹھتے دو دن میں اگر مَردوں پہ پڑتا بار یہ
افسوس دُنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا
حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا
اکثر تمھارے قتل پر قوموں نے باندھی ہے کمر
دیں تا کہ تم کو ایک قلم خود لوحِ ہستی سے مِٹا
گاڑی گئیں تم مدّتوں مٹّی میں جیتی جاگتی
حامی تمھارا تھا نہ یاور کوئی جز ذاتِ خُدا
زندہ سدا جلتی رہیں تم مُردہ خاوندوں کے ساتھ

اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا
بیاہی گئیں اُس وقت تم جب بیاہ سے واقف نہ تھیں
جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچّے دھاگے سے بندھا
بیاہا تمھیں ماں باپ نے اے بے زبانو! اس طرح
جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سزا
گزری اُمید و بیم میں جب تک رہا باقی سہاگ
بیوہ ہوئیں تو عمر بھر چین قسمت میں نہ تھا
تم سخت سے سخت امتحاں دیتی رہیں پر رائگاں
کیں تم نے جانیں تک فدا کہلائیں لیکن بے وفا
گو صبر کا اپنے نہ کچھ تم کو ملا انعام یاں
پر جو فرشتہ سے نہ ہو وہ کر گئیں تم کام یاں
گزرے تھے جگ تم پر کہ ہمدری نہ تھی تم سے کہیں
تھا منحرف تم سے فلک برگشتہ تھی تم سے زمیں
دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پا کر آدمی بننا تمھیں زیبا نہیں
یاں تک تمھاری ہجو کے گائے گئے دُنیا میں راگ
تم کو بھی دُنیا کی کہن کا آگیا آخر یقیں
علم و ہنر سے رفتہ رفتہ ہو گئیں مایوس تم
سمجھا لیا دل کو کہ ہم خود علم کے قابل نہیں

جو ذلتیں لازم ہیں دنیا میں جہالت کے لئے
وہ ذلتیں سب نفس پر اپنے گوارا تم نے کیں
سمجھا نہ تم کو ایک دن مردوں نے قابل بات کے
تم بیویاں کہلائیں لیکن لونڈیاں بن کر رہیں
آخر تمھاری چُپ دلوں میں اہل دل کے چُبھ گئی
سچ ہے کہ چپ کی داد آخر بے ملے رہتی نہیں
بارے زمانہ نیند کے ماتوں کو لایا ہوش میں
آیا تمھارے صبر پر دریائے رحمت جوش میں (حالی)

ترجیع بند لغوی معنی بند کو پھر بیان کرنا یعنی ایک مصرع یا بیت کو بند والی نظموں میں ٹیپ کی جگہ بار بار ہر بند کے بعد لانا۔ ایسی نظم کو ترجیع بند کہتے ہیں۔ یہ نظم بالکل ترکیب بند کی طرح ہوتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ترکیب بند میں گرہ کا شعر نیا ہوتا ہے اور ترجیع بند میں گرہ کا شعر ایک ہی ہوتا ہے جو ہر بند کے آخر میں بار بار لایا جاتا ہے۔ ترجیع بند یا ترکیب بند میں تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں اور ہر بند کے قافیے مختلف ہوتے ہیں۔

مثال

ہر چیز میں خدا جلوہ گر ہے

تنہا نہ اُسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان | ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان
بیرنگ میں با رنگ میں نیرنگ میں پہچان | منزل میں مقامات میں فرسنگ میں پہچان
نت رُوم میں اور ہند میں اور زنگ میں پہچان | ہر بُوم میں ہر صلح میں ہر جنگ میں پہچان

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

گاتا ہے کوئی شوق میں کرتا ہے کوئی حال | چھانے ہے کوئی خاک اُڑاتا ہے کوئی مال

ہنستا ہے کوئی شاد کسی کا ہے بُرا حال ‏‏ رونا ہے کوئی ہو کے غم و درد میں پامال
ناچے ہے کوئی شوخ بجاتا ہے کوئی تال ‏‏ پہنے ہے کوئی چیتھڑے اوڑھے ہے کوئی شال
کرتا ہے کوئی ناز دکھاتا ہے کوئی بال ‏‏ جب غور سے دیکھا تو اسی کی ہے یہ سب چال

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

جاتا ہے حرم میں کوئی قرآن بغل مار ‏‏ کہتا ہے کوئی دیر میں پوتھی کی سماچار
پہنچا ہے کوئی پار بھٹکتا ہے کوئی وار ‏‏ بیٹھا ہے کوئی عیش میں پھرتا ہے کوئی زار
عاجز کوئی بیکس کوئی ظالم کوئی لٹھ مار ‏‏ مفلس کوئی ناچار تونگر کوئی زردار
زخمی کوئی ماندہ کوئی اچھا کوئی بدکار ‏‏ جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں سب اسرار

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

ہے کوئی دلی دوست کوئی جان کا دشمن ‏‏ بیٹھا ہے پہاڑوں میں کوئی پھرتا ہے بن بن
مالا کوئی جپتا ہے کوئی شوق میں سمرن ‏‏ چھوڑے ہے کوئی مال سمیٹے ہے کوئی دھن
نکلے ہے جواہر کے کوئی پہن کے ابرن ‏‏ لوٹے ہے کوئی خاک میں رو رو کے ملا تن
جوگی کوئی بھوگی کوئی سوگی کوئی سوگن ‏‏ جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں یہ سب فن

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان ‏‏ (نظیر اکبرآبادی)

مستزاد رباعی کے مصرعے کے آخر میں ایک حصّہ رباعی کا لاتے ہیں۔ مگر اب غزل کو بھی مستزاد کرنا جائز ہے۔ ہر مصرعے کے آخر میں دو ایک کلمے وزن سے زیادہ ملا دیتے ہیں یہ زائد لفظ اسی بحر میں ہوتے ہیں جو اصلی مصرعے کے دو آخری رکنوں کی ہوتی ہے۔ مگر ان کا قافیہ کہیں علاحدہ بھی ہوتا ہے۔

مثال

تمھیں تم ہو

کس لئے کرتے ہو ایجاد نرالے غمزے	کچھ تو بتلاؤ ذرا
آپ عاشق ہوئے اور آپ ہی معشوق ہوئے	یہ کرشمہ کیسا؟
کبھی لیلیٰ بنے اور گوشۂ محمل میں چھپے	خوب پردے میں رہے
قیس بن کر کبھی اک عمر بیاباں میں پھرے	کہا اسمیٰ لیلیٰ
عاشق زار کبھی بن کے پھرے لالۂ زار	آپ ہی مثل ہزار
رنگ دیکھے کبھی گل بن کے چمن میں اپنے	یہ شگوفہ ہے نیا
شمع بن کر کبھی ظلمت میں دکھایا وہ نور	جسے کہتے ہیں ظہور
بن کے پروانہ کبھی اپنی محبّت میں جلے	ہو گئے جل کے فنا
کس سے کرتے ہو یہ تقریر وہ ہے کون عزیز	کچھ بھی ہے تم کو تمیز
کوئی عاشق ہے نہ معشوق یہ سب ہیں دھوکے	تمھیں تم ہو بخدا

(عزیز لکھنوی)

معرّیٰ (بلینک ورکس) یہ مغربی طرز کی ایک نظم ہے۔ ایک بحر میں ایک نظم لکھتے ہیں مگر ہر مصرعے کا قافیہ جدا جدا ہوتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ قافیہ کسی شعر اور مصرعے میں ہوتا ہی نہیں۔ اس طرز کے موجد کا خیال ہے کہ قافیہ اور ردیف کی قید طبیعت و خیال کی آمد میں حارج ہوتی ہے مگر شاعر وہی ہے جو قیود و حدود میں بھی رہ کر آزاد ہو۔ بغیر ردیف اور قافئے کے کلام میں موسیقی پیدا نہیں ہوتی۔

مثال

اے ساقیہ اے مطربہ!	ڈھال اور اپنا ساز چھیڑ
بے چین ہوں، بے کیف ہوں	کیوں مجھ پہ رحم آتا نہیں

کب تک ہجومِ رنج و غم کب تک یہ تشنہ کامیاں
تو مست ہے، میں بے قرار تو شاد، میں اندوہگیں!
لِلّٰہ مجھ پر رحم کر
برسا دے نعمتوں کی شراب
(نامعلوم)

سانیٹ | یہ دراصل انگریزی نظم کی ایک قسم ہے۔ جس کی تقلید اب اردو میں بھی ہونے لگی ہے۔ اس میں عموماً ۱۴ مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے ایک مصرع ایک ردیف اور قافئے میں لکھتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے ردیف و قافیہ میں۔ پھر ایک مصرع پہلے مصرعے کی ردیف اور قافئے میں لکھ کر ایک بند پورا کرتے ہیں۔ جب دو یا تین بند اس طرح ہو جاتے ہیں تو سب کے بعد ایک مطلع کسی دوسرے ردیف و قافئے میں لکھ کر نظم ختم کر دیتے ہیں۔ مگر پوری نظم کسی ایک ہی بحر اور ایک ہی موضوع پر ہوتی ہے۔

مثال

"جمنا کے ساحل پر"

وہ دیکھو بہہ رہا ہے آبِ جمنا کس روانی سے
نسیمِ صبح سے اس میں ترنّم آشکارا ہے
کہ موسیقی ہوا میں اور ہر منظر میں نغما ہے
یہ لہروں نے چُرائی ہے ادا کس کی جوانی سے

چلی آتی ہیں کمسن دیویاں اشنان کرنے کو
اِسی جوشِ مسرّت میں یہ لہریں جوش ماریں گی
اِسی دُھن میں یہ سب پُرکیف اک نغمہ الاپیں گی
وہ گویا ساز میں آتی ہیں اپنا سوز بھرنے کو

روانی آب کو ملتی ہے شاعر کے تخیّل سے
مسلسل کاروانِ جادۂ مستی ہے پانی بھی
خرامِ فتنۂ ہستی ہے جمنا کی روانی بھی
تلاطم فطرتاً محروم ہے صبر و تحمّل سے

نہیں معلوم منزل کون سی اس کی نظر میں ہے
مثالِ دَورِ عالم رات دن اپنے سفر میں ہے (ضیا چینیوٹی)

اقسامِ نظم بہ اعتبارِ مضمون

عام طور پر ہمارے اہلِ ادب نے شعر کی تقسیم بحر، وزن، قافیہ اور ردیف وغیرہ کے لحاظ سے کی ہے۔ اس لئے شاعری کی صرف چند محدود قسمیں مثلاً غزل، قصیدہ اور مثنوی وغیرہ پیدا ہوئیں، لیکن محققین ادبا نے جن کے سامنے عربی شاعری کے نمونے تھے، شاعری کی تقسیم مضمون و معنی کے لحاظ سے کی ہے۔ اس لئے ان اصناف کے علاوہ انھوں نے شاعری کی اور بھی چند صنفیں نکالی ہیں، جو اگرچہ وزن و قافیہ میں اصناف متذکرہ بالا سے مختلف نہیں، لیکن معنیً ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

(۱) خمریات	(۶) مرثیہ
(۲) ریختی	(۷) سلام
(۳) فخریہ	(۸) مناجات
(۴) رزمیہ	(۹) مناظرِ قدرت
(۵) واسوخت	(۱۰) سہرا

(۱۱) غزل مسلسل
(۱۲) شہر آشوب
(۱۳) عالم آشوب
(۱۴) شعر آشوب
(۱۵) ہجو
(۱۶) اخلاقی
(۱۷) تخیلی
(۱۸) مذہبی
(۱۹) صوفیانہ
(۲۰) فلسفیانہ
(۲۱) ظرافت
(۲۲) مزاح
(۲۳) ہزل
(۲۴) بذلہ
(۲۵) پند
(۲۶) طنز

خمریات | شاعرانہ حیثیت سے اس صنف کے لئے صرف یہ شرط ہے کہ اشعار برجستہ، صاف رواں اور مستانہ ہوں، اور طرزِ ادا میں جوش اور الفاظ میں طرب انگیزی اور رنگینی پائی جائے۔

عربی شعرا میں اخطل اور ابو نواس اور ایرانی شعرا میں خیام اور حافظ نے اس صنف کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اور شاعری میں قدما کے دورِ تغزل کے بعد جب رندی و ہوسناکی کا دور شروع ہوا، تو آتش اور تلامذۂ آتش نے اس قسم کے خیالات کو زیادہ شوخ کیا۔ غالب عملاً شراب نوشی کا مشغلہ رکھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے بھی اس صنف میں نہایت مستانہ اور پرجوش اشعار کہے اور متاخرین میں داغ اور ریاض نے بھی اس میں نمایاں شہرت حاصل کی۔ اردو شعرا کے کلام میں اس قسم کے رندانہ اشعار کی کافی تعداد موجود ہے۔

خمریات کے سلسلے میں بہتر تو یہی ہے کہ صرف ساقی و پیرِ مغاں، جام و ساغر شیشہ و مینا، سبزہ جوئبار اور باغ و بہار کا ذکر کیا جائے۔ لیکن جب آزادیٔ خیال زیادہ بڑھ جاتی ہے تو مذہب بھی اس کی زد میں آجاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں زاہدوں اور واعظوں کی پگڑیاں بھی اوچھالی جاتی ہیں، ان کی ریشِ مبارک پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ ان کو صلواتیں سنائی جاتی ہیں۔

مثالیں

اتنی کثرت سے اڑے ساقی پھر اتنی تند و تیز
اچھے اچھے پینے والے آج توبہ کر اٹھے (ریاض)

اتری ہے آسمان سے جو کل اٹھا تو لا
طاق حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا (ریاض)

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں (داغ)

چور ہو جاؤں مگر جاؤں نہ مے خانے سے
عہد شیشے سے تو پیمان ہے پیمانے سے (داغ)

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے (غالب)

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے (غالب)

دخترِ رز مری مونس مری ہمدم ہے
میں جہانگیر ہوں، وہ نور جہاں بیگم ہے (آتش)

فصلِ گل ہے چار دن، ساقی تکلف ہے ضرور
پر جواہر کے لبطے کو لگایا چاہئے (آتش)

ریختی معشوق کے حسن ظاہری کی تو عام طور پر تعریف کی جاتی ہے۔ مگر بعض شعرا نے کھلم کھلا اور رنگ اختیار کر لیا اور یہ حسن پرستی ایک خاص طرز میں ظاہر ہوئی جس کا نام "ریختی" یعنی عورتوں کی زبان رکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے یہ لفظ ریختہ سے نکلا ہے اور اس کا مونث ہے۔ عورتوں کی زبان بالذات کوئی مذموم بات نہیں، مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس قسم کے اشعار جذبات انسانی کو برانگیختہ کرنے کی غرض سے کہے جاتے تھے اور اسی وجہ سے وہ نہایت فحش اور مخرب اخلاق اور کانوں تک ناگوار ہوتے تھے۔ یہ صنف شاعری اب تقریباً متروک ہے۔ سعادت یار خاں رنگین اور ان کے دوست انشا اس صنف شاعری میں خاص طور پر مشہور ہیں۔

مثال

اری بی ایک ہی عیار ہو تم
ناک چوٹی میں گرفتار ہو تم

چھیڑ کے بات سوا اور نہیں
یعنی لڑنے ہی پہ تیار ہو تم

کس سے اقرار ہوا جو ہم سے
کرتی ہر بات پہ انکار ہو تم

بیٹھتی پاس نہیں جو آ کر
کیا مری شکل سے بے زار ہو تم

سچ نہ بولی کبھو انشا سے، چلو   اجی سب جھوٹوں کی سردار ہو تم (انشا)

دیگر

صدقے اپنے نہ ہو، اس کے کوئی قربان ہو نوج
ایسے لوگوں کا کسی شخص کو ارمان ہو نوج
یوں اشارے سے کہا مجھ سے خفا سے کیوں ہو
جان اور بوجھ کے ایسی کوئی انجان ہو نوج
پڑھوں لاحول نہ کیوں، ہے تجھے شیطان لگا
لاگو ایسے کی کوئی اے موئی شیطان ہو نوج
باجی کہتی ہیں کہ ایک مردوے پہ غش ہے تو
مفت ایسا بھی کسی شخص پہ بہتان ہو نوج
ل کے انشا سے پشیمان ہوئے ہیں تو بہت
دل لگا کر کوئی ایسے سے پشیمان ہو نوج (انشا)

فخریہ نوعی حیثیت سے قصیدہ اور فخریہ دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔ اس لئے اوصاف کی تحدید، تقسیم، ترتیب اور ان کے حسن و قبح کا معیار جو قصیدے کا ہے وہی فخریہ کا بھی ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ قصیدے میں شاعر کا ممدوح ایک دوسرا شخص ہوتا ہے اور فخریہ میں وہ خود اپنی یا اپنی قوم کی مدح کرتا ہے۔ عام طور پر فخریہ شاعری کی ابتدا باہمی مقابلے سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کے قبائل میں چونکہ ہمیشہ کشمکش رہتی تھی، اس صنف شاعری کو زیادہ ترقی ہوئی۔ لیکن فارسی اور اردو شعرا میں اس قسم کے مقابلے بہت کم ہوئے۔ اس لئے فارسی اور اردو شاعری میں اس صنف کو بہت کم فروغ حاصل ہوا۔ البتہ مرثیہ گویوں نے شہدائے کربلا کی زبان سے بہ کثرت فخریے لکھے ہیں۔

مثال ۱۰

زورِ سخن

نمک خوانِ تکلّم ہے فصاحت میری — ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت میری
رنگ اُڑتے ہیں وہ رنگین ہے عبارت میری — شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں
پانچویں پشت ہے شبّیر کی مدّاحی میں

ایک قطرہ کو جو دوں بسط تو قلزم کردوں — بحرِ مواج فصاحت کا تلاطم کردوں
ماہ کو مہر کروں ذرّوں کو انجم کردوں — گُنگ کو ماہرِ اندازِ تکلّم کردوں

دردِ سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بُلبُلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

کیوں نہ ہو بندۂ موروثی مُولا ہوں میں — قلزمِ رحمتِ معبود کا قطرہ ہوں میں
جس میں لاکھوں دُرِ مرجاں ہیں وہ دریا ہوں میں — مدح خوانِ پسرِ حضرتِ زہرا ہوں میں

وصف جوہر کا کروں یا صفتِ ذات کروں
اپنے رُتبے پہ نہ کیوں آپ مباہات کروں (میر ببر علی انیس)

مثال ۱۱

شانِ سخن

اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے — اے طنطنۂ طبع جز و کُل کو ملا دے
اے معجزۂ فکر فصاحت کو جلا دے — اے زمزمۂ نطق بلاغت کا صلا دے

اے بائے بیاں معنیٔ تسخیر کو حل کر
اے سینِ سخن قاف سے تا قاف عمل کر

بولا علم خامہ فلک پر میں گڑوں گا — سکّہ نے ندا دی زرِ انجم پہ پڑوں گا
معنی نے کہا بیت میں آئینہ جڑوں گا — مضمون پکارا میں کسی سے نہ لڑوں گا

بندش یہ کھلی دم میں فصاحت کا بھروں گی
چلائی طبیعت کہ میں اصلاح کروں گی

کہتا ہے سخن حضرت استاد ہمیشہ　　مضموں میں نئے کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ
بھولے سے بتادوں تو رہے یاد ہمیشہ　　کہنے میں ہے تاثیر خدا داد ہمیشہ
بے لطف خدا یہ ہمہ دانی نہیں آتی
پر شمع صفت چرب زبانی نہیں آتی

یعنی سخن شہرہ فگن ہے مرے قابل　　قابل میں سخن کے ہوں سخن ہے مرے قابل
موتی کو صدف اور یہ عدن ہے مرے قابل　　رضوان کو جنت یہ چمن ہے مرے قابل
شہرہ ہے یہ تائیدِ شہ جن و ملک سے
مضموں مرا گھر پوچھتے آتے ہیں فلک سے

جھک کر شرفا اور نجبا ملتے ہیں سب سے　　خامہ ہے فروتن مرا افراطِ ادب سے
جس طرح سے بد اصل جدا نیک نسب سے　　نخوت کے معانی ہیں الگ لفظوں کے لب سے
دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو
مانند غبار اُٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو　　(مرزا سلامت علی دبیر)

مثال ۳

حضرت امام حسین کا رجز

حضرت یہ رجز پڑھتے تھے تولے ہوئے شمشیر　　اعدا کی زبانوں پہ یہ حیرت کی تھی تقریر
میں یوسفِ کنعان رسالت کی ہوں تصویر　　دیکھو نہ مٹاؤ مجھے اے فرقۂ بے پیر!
واللہ تعلّی نہیں یہ کلمۂ حق ہے
عالم کے مرقع میں حسین ایک ورق ہے

محتاج ہوں پر مجھ سا تونگر نہیں کوئی　　واللہ جہاں میں مرا ہمسر نہیں کوئی

ہاں میرے سوا شافع محشر نہیں کوئی　　یوں سب ہیں مگر سبط پیمبر نہیں کوئی
باطل ہے اگر دعویٰ اعجاز کرے گا
کس بات پہ دنیا میں کوئی ناز کرے گا

ہم وہ ہیں کہ اللہ نے کوثر ہمیں بخشا　　سرداری فردوس کا افسر ہمیں بخشا
اقبال علی خلق پیمبر ہمیں بخشا　　قدرت ہمیں دی، زور ہمیں، زر ہمیں بخشا
ہم نور ہیں گھر طور تجلّا ہے ہمارا
تخت بنِ داؤد مصلّا ہے ہمارا

یہ فرق پہ عمّامۂ سردار زمن ہے　　یہ تیغ علی ہے یہ کمر بند حسن ہے
یہ جوشن داؤد ہے جو حافظ تن ہے　　یہ پیرہن یوسف کنعان محن ہے
دکھلائیں سند دست رسول عربی کی
یہ مہر سلیماں ہے، یہ خاتم ہے نبی کی

سب قطرے ہیں گر فیض کے دریا ہیں تو ہم ہیں　　ہر نقطۂ قرآں کے شناسا ہیں تو ہم ہیں
حق جس کا ہے جامع وہ ذخیرہ ہیں تو ہم ہیں　　افضل ہیں تو ہم عالم و دانا ہیں تو ہم ہیں
تعلیم ملک عرش پہ تھا ورد ہمارا
جبریل سا استاد ہے شاگرد ہمارا
(میر ببر علی انیس)

رزمیہ　رزمیہ نظم کا یہ اصول ہے کہ سب سے پہلے لڑائی کی تیاری، معرکے کا زور وشور، تلاطم، ہنگامہ خیزی، ہلچل، شور و غل، نقاروں کی گونج، ٹاپوں کی آواز، ہتھیاروں کی جھنکار، تلواروں کی چمک دمک، تیروں کی لچک، کمانوں کا کڑکنا، نقیبوں کا گرجنا، ان چیزوں کا اس طرح بیان کیا جائے کہ آنکھوں کے سامنے معرکۂ جنگ کا سماں چھا جائے۔ پھر بہادروں کا میدان جنگ میں آنا، مبارز طلب ہونا، باہم معرکہ آرائی کرنا، لڑائی کے داؤں پیچ دکھانا، ان سب کو بیان کیا جائے۔ اس کے ساتھ اسلحۂ جنگ اور دیگر سامانِ جنگ کی الگ الگ تصویر کھینچی جائے۔ پھر فتح

یا شکست کا بیان کیا جائے اور اس طرح کیا جائے کہ دل دہل جائیں اور طبیعتوں پر اُداسی یا غم کا عالم چھا جائے۔ فارسی میں "شاہنامہ" اور "سکندر نامہ" رزمیہ شاعری کی مشہور کتابیں ہیں۔ اردو شاعری میں میر انیس اس صنف شاعری میں خاص درجۂ امتیار رکھتے ہیں۔

مثال

ہنگامۂ جنگ

نقارۂ دغا پہ لگی چوب یک بیک — اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
شہپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک — قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت و در تلک
شور دُہل سے حشر تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

گھوڑوں سے گونجتا تھا وہ سب وادیٔ نبرد — گردن میں مثل شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تھا چرخ چار میں پہ رُخ آفتاب زرد — ڈر تھا گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمی ہجوم فوج سے دہ چند ہو گئی
خاک اس قدر اُڑی کہ ہوا بند ہو گئی

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخ لاجورد — مانند کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اُٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلے میں گرد — تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
گرمی سے رن کے ہوش اُڑے وحش و طیر کے
شیر اُس طرف اتر گئے دریا کو پیر کے

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در — جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنات کانپ کانپ کے کہتے تھے الحذر — دنیا میں خاک اُڑتی ہے اب جائیں ہم کدھر
اندھیر ہے، اُٹھی برکت اب جہاں سے
لو ہل گیا زمیں کا طبق آسمان سے

تھرّا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد
ہلتے تھے کوہ، کانپتا تھا وادیٔ نبرد
تھا دن بھی زرد، دھوپ بھی زرد اور زمیں بھی زرد
خورشید چھپ گیا، یہ اٹھی کربلا میں گرد
اک تیرگی غبار سے تھی چشم مہر میں
ٹاپو پڑے ہوئے تھے محیط سپہر میں
(میر ببر علی انیس)

واسوخت نظم کی وہ قسم ہے جس میں عاشق اپنے معشوق کی بے وفائی، ظلم و ستم، رقیب کے ساتھ بے جا محبت اور جدائی کی مصیبت و تکلیف کی شکایتیں کرتا ہے۔ گویا معشوق کو دھمکاتا ہے کہ اگر اس کا طرز تغافل اور ستم شعاریاں اسی طرح باقی رہیں، تو پھر اس کے ہاتھ سے عنانِ صبر چھوٹ جائے گی اور وہ معشوق سے علاحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

مثال

اے ستم گر کہاں تلک بیداد
سرِ پامال عاشقِ ناشاد
قول دینا عدو کو حسب مراد
مر گیا تیرے ہاتھ سے فریاد
فکر جور و سرِ جفا کب تک
بے وفا غیر سے وفا کب تک

اب بھی آ، جانے دے دل آزاری
چھوڑ دے خودسری و خونخواری
دیکھ اچھی نہیں ستم گاری
نہ پڑے صبر نالہ و زاری
کہیں تو بھی نہ دل کو کھو بیٹھے
کہیں آنکھوں کو یوں نہ رو بیٹھے

حسن، آخر ہے بے وفا نہ رہے
چہرہ گل رنگ باصفا نہ رہے
شوخیٔ نازش و ادا نہ رہے
لب شیریں میں کچھ مزا نہ رہے
شور اٹھے نہ خوش خرامی سے
بے حلاوت ہو تلخ کامی سے

تیغ ابرو سے دل فگار نہ ہو　　تیر مژگاں جگر کے پار نہ ہو
خنجر غمزہ زخم بار نہ ہو　　کوئی دنیا میں جاں نثار نہ ہو
اک قلق طبع نازنیں پہ رہے
بے ارادہ شکن جبیں پہ رہے

چھوڑنے کی مرے ندامت ہو　　آپ کو دم بدم ملامت ہو
بیٹھتے اٹھتے اک قیامت ہو　　پھر ملے تجھ سے کس کی شامت ہو
یوں غضب میں رہے بلا میری
یہ مصیبت سہے بلا میری

فکر انجام سے نہ ہو انجان　　مجھ سے مل جا تو میرا کہنا مان
اس زمانے کو ظالم آیا جان　　دل میں اپنے ذرا سمجھ نادان
کب تلک کوئی نامراد رہے
بھول جاؤں گا میں بھی یاد رہے

کوئی بھی اس طرح جلاتا ہے　　کوئی بھی اس قدر ستاتا ہے
کوئی بھی اتنا بھول جاتا ہے　　یہی رہ رہ کے جی میں آتا ہے
میں بھی پروا تری ذرا نہ کروں
ہوں تو عاشق ولے وفا نہ کروں

وہ جو ہمدم ہے تیری مہ پارہ　　شوخ جیسے نجوم سیارہ
وہ بھی ہوتی چلی ہے آوارہ　　تازہ تازہ ہے شوق نظارہ
مژہ سے شوخیاں ٹپکتی ہیں
آنکھیں زہرہ نمط جھپکتی ہیں

ڈھب پہ اپنے اسے لگا لوں گا　　حسرت و آرزو نکالوں گا

تجھ سے بے باک تر بنا لوں گا ناز و انداز سب سکھا لوں گا
چاہیے آفت زمانہ بنے
غیر نا آشنا، یگانہ بنے
دم ترا شوخیوں سے ناک میں لائے سونگھ کر بو کو تیری ناک چڑھائے
دست گل گوں سے اپنے عطر لگائے بگڑے جتنا تو اور تجھ کو بنائے
بس ترا اس کے ہاتھ سے نہ چلے
حسرتوں سے تو اپنے ہاتھ ملے
مت برا مان عرض بے جا کا کیا گلہ حرفِ اہلِ سودا کا
کر علاج آہ تاب فرسا کا اب تلک وقت ہے مدارا کا
گر مکافاتِ ہجر دل جو ہو
پھر وہی میں اور وہی تو ہو (مومن)

مرثیہ مرثیہ وہ صنف نظم ہے جس میں کسی مردہ شخص کی تعریف کی جائے۔ یہ قصیدے کے برعکس ہے۔ کیوں کہ قصیدے میں کسی زندہ شخص کی تعریف کی جاتی ہے۔

اصطلاح میں مرثیہ اسی نظم کو کہتے ہیں جس میں حضرت امام حسینؓ اور دیگر شہیدانِ کربلا کی شہادت کا ذکر کیا جائے اور جو علی العموم محرم کے زمانے میں کسی مجلس عزا میں یا کسی تعزیے کے ساتھ بہت سوز و گداز اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔

ابتدا میں اس قسم کی نظمیں صرف بَین تک محدود ہوتی تھیں۔ امتداد زمانہ سے مرثیئے کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور اس میں مختلف قسم کے نئے نئے مضامین داخل ہونے لگے۔ مثلاً چہرہ، ممدوح کے مناقب، دشمنوں کے مصائب، مناظر جنگ، مناظر قدرت، رجز خوانی، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، سامانِ حرب و ضرب وغیرہ۔ اس قسم کے مضامین کے اضافے سے مرثیئے کا رتبہ بڑھ گیا اور آخر کار وہ اردو نظم کی ایک مستقل قسم بن گیا۔

شہیدانِ کربلا کے علاوہ اور بھی متعدد اشخاص کے مرثیے لکھے گئے ہیں۔ ان کے سوائے جس شخص کا مرثیہ لکھا جائے اس کے ساتھ اس کے نام کا ہونا ضروری ہے مثلاً مرثیۂ غالب مرثیۂ داغ، مرثیۂ عارف وغیرہ۔

مثال

آج شبیرؑ پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

آج شبیرؑ پہ کیا عالمِ تنہائی ہے — ظلم کی چاند پہ زہراؑ کے گھٹا چھائی ہے
اُس طرف لشکرِ اعدا میں صف آرائی ہے — یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے
برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مار لو پیاسے کو، ہے شور ستمگاروں میں

زخمی بازو ہیں کمر خم ہے بدن میں نہیں تاب — ڈگمگاتے ہیں نکل جاتی ہے قدموں سے رکاب
پیاس کا غلبہ ہے لب خشک ہیں آنکھیں ہیں پُر آب — تیغ سے دیتے ہیں ہر وار کا اعدا کو جواب
شدّتِ ضعف میں جس جا پہ ٹھہر جاتے ہیں
سیکڑوں تیرِ ستم تن سے گذر جاتے ہیں

گیسو آلودۂ خوں لپٹے ہیں رخساروں سے — شانے کٹ کٹ کے لٹک آئے ہیں تلواروں سے
تیر پیوست ہیں خوں بہتا ہے سوفاروں سے — لاکھ آفت میں ہے اک جان دل آزاروں سے
فکر ہے سجدۂ معبود میں سر دینے کی
وار سے تیغوں کی فرصت نہیں دم لینے کی

خوں میں تر پیچ عمامے کے ہیں سر زخمی ہے — ہے جبیں چاند سی پُر نور مگر زخمی ہے
سینہ سب برچھیوں سے تا بہ کمر زخمی ہے — تیر بیداد سے دل زخمی جگر زخمی ہے
ضربِ شمشیر سے بیکار ہیں بازو دونوں
ظلم کے تیروں سے مجروح ہیں پہلو دونوں

برچھی آکر کوئی پہلو پہ لگا جاتا ہے — مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آجاتا ہے
بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹا جاتا ہے — بند آنکھیں ہیں سر پاک جھکا جاتا ہے
گرد زہراؑ و علیؑ گریہ کناں پھرتے ہیں
غل ہے گھوڑے سے امام دو جہاں گرتے ہیں

گرتے ہیں قطرۂ خوں زخم جبیں سے پیہم — دست مجروح سے کھنچ سکتے نہیں تیر ستم
فکر ہے بخششِ اُمت کی کچھ اپنا نہیں غم — کرتے ہیں حمد خدا خشک زباں سے ہر دم
ہے عبا تیروں سے غربال قبا گلگوں ہے
ہونٹ یاقوت سے زخمی ہیں دہن پُر خوں ہے

زیں سے ہوتا ہے جدا دوش محمد کا مکیں — چمن فاطمہؑ کا سرو ہے مائل بہ زمیں
برچھیاں گرد ہیں اور بیچ میں ہے سرور دیں — ہے یہ نزدیک گرے مُہر نبوّت کا نگیں
پانوں ہر بار رکابوں سے نکل جاتے ہیں
یا علی کہتی ہے زینب تو سنبھل جاتے ہیں

لاکھ شمشیریں ہیں اور ایک تن اطہر ہے — ایک مظلوم ہے اور ظالموں کا لشکر ہے
سیکڑوں خنجر فولاد ہیں اور اک سر ہے — نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی یاور ہے
باگ گھوڑے کی لٹکتی ہے اُٹھا سکتے نہیں
سامنے اہل حرم روتے ہیں جا سکتے نہیں

کوئی سیّد کا نہیں آہ بچانے والا — حربے لاکھوں ہیں اور اک زخم اٹھانے والا
پیاس میں کوئی نہیں پانی پلانے والا — سنبھلے کس طرح بھلا برچھیاں کھانے والا
چرخ سے آگ برستی ہے زمیں جلتی ہے
مارے گرمی کے زباں خشک ہے لُو چلتی ہے

کہیں دم لینے کو سایہ نہیں ہے وقت زوال — اینٹھی جاتی ہے زباں، پیاس کی شدت ہے کمال

کبھی زینب کا ہے غم، گاہ سکینہ کا خیال
دن جو ڈھلتا ہے تو حضرت ہوئے جاتے ہیں نڈھال
مثل خورشید بدن ضعف سے تھراتا ہے
نیّر برج امامت پہ زوال آتا ہے

کہتے ہیں ظالموں سے خشک زباں دکھلا کر
بہر حق پانی کا اک جام پلا دو لا کر
اہل کیں کہتے ہیں یہ تیغ ستم چمکا کر
آب شمشیر پیو برچھیوں کے پھل کھا کر
یہ سخن سن کے بھی غصّہ نہیں فرماتے تھے
یاس سے سوئے فلک دیکھ کے رہ جاتے تھے

عرض کرتے ہیں یہ خالق سے کہ اے ربِّ غفور
تو ہے عالم کہ نہیں کچھ ترے بندے کا قصور
کرتے ہیں یہ مجھے بے جرم خطا تیغوں سے چور
ہاتھ امّت پہ اٹھانا نہیں مجھ کو منظور
جانتے ہیں کہ محمدؐ کا نواسا ہوں میں
پانی دیتے نہیں، دو روز کا پیاسا ہوں میں

(میر ببر علی انیس)

مرثیۂ داغ

عظمت غالب ہے، اک مدت سے پیوند زمیں
مہدی مجروح ہے شہر خموشاں کا مکیں
توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشم محفل میں ہے اب تک کیف صہبائے امیر
آج لیکن ہم نوا سارا چمن ماتم میں ہے!
شمع روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے!
بلبلِ دلّی نے باندھا اس چمن میں آشیاں
ہم نوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کے جہاں
چل بسا داغ آہ! میت اس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن! وہ شوخیٔ طرزِ بیاں!
آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں
تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٔ معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز؟
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز؟

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں
اپنے فکر نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں

تلخیٔ دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے
یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سینکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی

اٹھیں گے آذر ہزاروں شعر کے بت خانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی! تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اُٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو، اے خاکِ دلی! داغ کو روتا ہوں میں

اے جہان آباد اے سرمایۂ بزمِ سخن
ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن

وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بُو ہوا
آہ خالی داغ سے کاشانۂ اُردو ہوا

تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں
وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

اُٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا
یادگارِ بزمِ دہلی ایک حالیؔ رہ گیا

آرزو کو خون رلواتی ہے بیدادِ اجل
مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل

کھل نہیں سکتی شکایت کے لئے لیکن زباں
ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں

ایک ہی قانونِ عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر
(اقبالؔ)

سلام | غزل کی طرز پر شہدائے کربلا کے واقعات نظم کرنے کو سلام کہتے ہیں۔

مثال

صبر کرتے تھے سلامی! شہِ والا کیا کیا — اہلِ کیں دیتے تھے مظلوم کو ایذا کیا کیا
شاہ فرماتے تھے پانی نہیں ملتا، لیکن — سامنے آنکھوں کے لہراتا ہے دریا کیا کیا
سرِ شبّیر سے کہتے تھے یہ رو رو سجّاد — رنج دیتے ہیں مجھے راہ میں اعدا کیا کیا
طوق و زنجیر سنبھالوں کہ مہار اونٹوں کی — کام اتنے ہیں کروں میں تنِ تنہا کیا کیا
رو رو، کہتی تھی یہ صغرا کہ کہے جا قاصد — تو نے کیا کیا کہا اور شاہ نے پوچھا کیا کیا
دیکھ کر فوجِ حسینی کو عدو کہتے تھے — ساتھ لائے ہیں جواں سیّدِ والا کیا کیا
خط لئے لاشۂ اکبر پہ یہ کہتے تھے امام — دیکھو بیٹا! تمہیں صغرا نے ہے لکھا کیا کیا (انیس)

مناجات | اس نظم کو کہتے ہیں جس میں خدا کی تعریف اور اپنی عاجزی ظاہر کرکے دعا اور التجا کی جائے۔

مثال

یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر — اے ابرِ کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر — گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیمِ سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری — بلبل کی زباں پر ہے تری شکرگذاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرتِ باری — پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری
وہ گل ہوں عنایت چمنِ طبعِ نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کی بو کو

غواصِ طبیعت کو عطا کر وہ لآلی — ہو جن کی جگہ تاجِ مہِ عرش پہ خالی
ایک ایک لڑی نظم ثریا سے ہو عالی — عالم کی نگاہوں سے گرے قطبِ شمالی

سب ہوں دُرِ یکتا نہ علاقہ ہو کسی سے
نذر اُن کے یہ ہوں گے جنھیں رشتہ ہے نبی سے

بھر دے دُرِ مقصود سے اس درجِ دہاں کو　　دریائے معانی سے بڑھا طبعِ رواں کو
آگاہ کر اندازِ تکلم سے زباں کو　　عاشق ہو فصاحت بھی وہ دے حُسنِ بیاں کو
تحسین کا سمٰوات سے غل تا بہ سمک ہو
ہر گوش بنے کانِ ملاحت وہ نمک ہو

ساقی کے کرم سے ہو وہ دورا ور چلیں جام　　جس میں عوضِ نشہ ہو کیفیت انجام
ہر مست فراموش کرے گردشِ ایّام　　صوفی کی زباں بھی نہ رہے فیض سے ناکام
ہاں بادہ کشو! پوچھ لو مے خانہ نشیں سے
کوثر کی یہ موج آگئی ہے خلدِ بریں سے

آؤں طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم　　خیبر کی خبر لائے مری طبعِ اولوالعزم
قطعِ سرِ اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم　　دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکۂ رزم
جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

ہو ایک زباں ماہ سے تا مسکنِ ماہی　　عالم کو دکھا دے برِشِ سیفِ الٰہی
جرأت کا دھنی تو ہے یہ چلائیں سپاہی　　لاریب ترے نام پہ ہے سکۂ شاہی
ہر دم یہ اشارہ ہو دوات اور قلم کا
تو مالک و مختار ہے اس طبل و علم کا!　　(انیس)

مناظرِ قدرت یا نیچرل شاعری نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معنیً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادات کے موافق ہو۔ لفظاً نیچر کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بہ مقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق

ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔ معنیٰ نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں، جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں، یا ہونی چاہئیں۔ جس شعر کا مضمون اس کے خلاف ہوگا، وہ ان نیچرل سمجھا جائے گا۔ مناظرِ قدرت میں باغ و بہار اور قدرتی مناظر ایک عام موضوع ہے۔

مثال

صبح کا سماں

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح	ہونے لگا اُفق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح	ہر سو ہوئی بُلند صدائے اذانِ صبح

پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

خورشید نے جو رُخ سے اُٹھائی نقابِ شب	در کھُل گیا سحر کا، ہوا بند بابِ شب
انجم کی فرد فرد سے لے کر، حسابِ شب	دفتر کشائے صبح نے، اُلٹی کتابِ شب

گردوں پہ رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطانِ غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے نہاں	چُن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں	مُرجھا کے رہ گئے ثمر و شاخِ کہکشاں

دکھلائے طور، بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور	یادِ خدا میں زمزمہ پردازیٔ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا، وہ فضا وہ نور	خنکی ہو جس سے چشم کو، اور قلب کو سرور

انساں زمیں پہ محو، ملک آسماں پر

جاری تھا، ذکر قدرت حق ہر زبان پر

وہ سرخیٔ شفق کی اُدھر چرخ پر بہار | وہ بارور درخت، وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار | پھولوں سے سب بھرا ہوا دامان کوہسار

نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

تھی دشت کربلا کی زمیں، رشک آسماں | تھا دُور دُور تک شب مہتاب کا سماں
چھٹکے ہوئے ستاروں کا ذرّوں پہ تھا گماں | نہر فرات بیچ میں تھی مثل کہکشاں

سرسبز جو درخت تھا وہ نخلِ طور تھا
صحرا کے ہر نہال کا سایہ بھی نور تھا (انیس)

سہرا لغت میں وہ پھولوں اور موتیوں کی لڑیاں جو دولھا، دلھن کے سر پر سے منھ پر لٹکائی جاتی ہیں۔ اصطلاح میں وہ نظم جو دولھا اور اس کے سہرے کی تعریف میں شعرا کہتے ہیں اس میں خوشی، خرمی اور شادی بیاہ کے مضامین حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں۔

یہ نہیں معلوم کہ سہرے کا موجد کون ہے، تاہم اردو کے سوا اس کا پتہ نہیں۔ اس لئے یہ اردو شاعری کی خاص چیز ہے، لیکن وقتی تہنیت و مبارک باد کے سوائے اس کی اور کوئی غرض نہ تھی۔ اس لئے مستند شعرا کے دواوین میں اس نے عموماً جگہ نہ پائی۔ البتہ غالبؔ اور ذوقؔ نے بہادر شاہ ظفر کے چھوٹے بیٹے مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر جو حریفانہ حیثیت سے سہرے لکھے ہیں، ان کو "سخن گسترانہ" بات نے ایک تاریخی چیز بنا دیا ہے۔

مثالیں

غالبؔ[1] کا سہرا

خوش ہو اے بخت! کہ ہے آج ترے سر سہرا | باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے | ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا ترا پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ / مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا نمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی / ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی / تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا / ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اِک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے / رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اِترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اِک چیز / چاہئیے پھولوں کا بھی ایک مقرّر سہرا

جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے / گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی چمک گوہرِ غلطاں کی چمک / کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار / لائے گا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اِس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

(غالب)

(۲)

ذوق کا سہرا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا / آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک / کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حُسن سے مانندِ شعاعِ خورشید / رُخِ پُر نور پہ ہے تیرے منوّر سہرا

وہ کہے صلِّ علیٰ یہ کہے سُبحان اللہ / دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تابنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم / گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی / گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیوں کر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار / تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش / سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اِک گہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اِترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطّر سہرا

سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوشِ آبِ مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنادو ان کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا
(ذوق)

غزل مسلسل | غزل مسلسل اس غزل کو کہتے ہیں جس میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہ ہو بلکہ ساری غزل کا مضمون اوّل سے آخر تک ایک ہو۔ ایسی غزل میں اکثر لمبے لمبے مضمون نظم کئے جاتے ہیں۔

مثال

نفس دعویٰ بے گناہی کا سدا کرتا رہا
گرچہ اترے جی سے دل اکثر ابا کرتا رہا

حق نے احساں میں نہ کی اور نے کفراں میں کمی
وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا

چوریوں سے دیدہ و دل کی نہ شرمایا کبھی
چپکے چپکے نفس خائن کا کہا کرتا رہا

منہ نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہ میں
ان سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا

تھا نہ استحقاق تحسیں پر سی تحسیں سدا
حق ہے جو دُوں ہمتی کا وہ ادا کرتا رہا

شہرت اپنی جس قدر بڑھتی گئی آفاق میں
کبر نفس اتنا ہی یاں نشو و نما کرتا رہا

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی مگر
نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا
(حالی)

شہر آشوب | وہ نظم ہے جس میں شاعر انقلاب زمانہ کا ذکر کر کے کسی شہر کی بربادی کا حال

بیان کرے۔ اسی طرح 'عالم آشوب' اور 'شہر آشوب' وغیرہ ہے۔

مثال شہر آشوب

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلّی　　بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلّی
جواب کاہے کو تھا، لاجواب تھی دلّی　　مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلّی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہ شہر وہ ہے۔ کہ انسان و جان کا دل تھا　　یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدر دان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا　　یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا
رہی نہ آدھی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

یہاں کی شام تھی مانند صبح نورانی　　یہاں کے ذرّے میں تھی مہر کی درخشانی
یہاں کے سنگ سے تیرہ تھا لعلِ رُمّانی　　یہاں کی خاک سے ہوتا تھا آئینہ پانی
یہ شہر وہ ہے کہ سایہ بھی نور تھا اس کا
چراغ، رشکِ تجلّیٔ طور تھا اس کا

خدا پرستوں کا شیوہ جفا پرستی ہے　　جو مال مست تھے اب ان کو فاقہ مستی ہے
بجائے ابر کرم، مفلسی برستی ہے　　بتنگ جینے سے ہیں ایسی تنگدستی ہے
غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا
یہ پورے بنے نہیں آئے خدا کا قہر آیا

عجیب شکل گل و گلستاں نظر آئی　　پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
جب اُٹھ کے تا مژہ خوں چکاں نظر آئی　　تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی
وہ گلرخانِ سمن بر کے قہقہے نہ رہے

وہ بلبلانِ خوش الحال کے چھپے نہ رہے

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا
تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا
غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں میں جو پتیاں گلاب کی تھیں

زمیں کے حال پہ اب آسمان روتا ہے
ہر اک فراقِ مکیں میں مکان روتا ہے
گدا و شاہ ضعیف و جوان روتا ہے
غرض یہاں کے لئے اک جہان روتا ہے

جو کہیے جوششِ طوفاں نہیں کہی جاتی
یہاں تو نوحؑ کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

برنگ بوئے گل اہل چمن، چمن سے چلے
غریب چھوڑ کے اپنا وطن، وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے
قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے

مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

جگہ جگہ تھے زمیندار وار کی صورت
چڑھے ہی آتے تھے سر پر بخار کی صورت
بلا سے کم نہ تھی ہر اک گنوار کی صورت
چھپی نہ ان سے پر اہل دیار کی صورت

کسی جگہ جو کوئی ہو کے بے قرار آیا
تو اہل قریہ بولے کہ "لو شکار آیا"

زباں جو بدلیں تو صورت بدل نہیں آتی
ملیں جو خاک بھی منہ پر تو مل نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی
پکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی

جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پرے سرکتے ہیں
جو لوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھسکتے ہیں

پیادہ پا ہوں رواں شہ سوار صد افسوس　　لہو کے گھونٹ پئیں بادہ خوار صد افسوس
ذلیل و خوار ہوں اہل وقار صد افسوس　　ہزار حیف دل بے قرار صد افسوس
جھکے ہیں بار الم سے تنے ہوئے کیسے
بگڑ گئے ہیں یکایک بنے ہوئے کیسے

کہاں تک آہ لکھوں اس کا حال بربادی　　کہاں تک آہ لکھوں آسماں کی جلادی
کسی کو قید محن سے نہیں ہے آزادی　　کہ داغ داغ ہے دل، ہر کوئی ہے فریادی
الٰہی پھر اسے آباد و شاد دیکھیں ہم
الٰہی پھر اسے حسب مراد دیکھیں ہم　　(داغ)

مثال عالم آشوب

چھائے عالم پہ ہیں افلاس کے ہر سو آثار　　تنگ دستی کا ہے جن سر پہ خلائق کے سوار
شہر آشوب لکھا کرتے تھے پہلے مگر، اب　　عالم آشوب کے لکھنے کا ہے مضموں تیار
کہتے ہیں پیسے میں اگلی سی وہ برکت نہ رہی　　ہو گیا لکشمی کے سائے سے خارج یہ دیار
تب پہلے گر ایک کماتا تھا تو دس کھاتے تھے　　اب کماتے ہیں سبھی اور سبھی ہیں نادار
تن ڈھکیں، پیٹ بھریں، کنبے کو کیونکر پالیں　　عقل عاجز ہے تو بے سود کفایت کا شعار
زندگی میں جڑی روٹی نہ لیں مرگ کفن　　دین و دنیا کی ہو پھر قید گلے کا کیوں ہار
نوکری پیشہ جو ہیں ان کا نہ پوچھو احوال　　ان پہ رہتی ہے مصائب کی ہمیشہ بھر مار
کرتے کیوں کر ہیں گزر اس سے سمجھ لیں بس آپ　　ہونے لگتا ہے پندرھویں سے ہی پہلی کا شمار
چل نہیں سکتے ضروری جو مصارف ہیں وہی　　عیش اور حسرت و ارماں کا ہے کیا ذکر اذکار
نوبت اب یہ ہے مہینے میں ہے باقی ہفتہ　　پان بیوی سے جو چھوٹا تو میاں سے بھی سگار
ملک کی ان کو امارت کا سمجھنا نہ اہیں　　تم کو دیتے ہیں دکھائی جو یہ بڑھیا تجار
ان کے ہاتھوں ہی نکلتی ہے وطن کی دولت　　قوم کے سر پہ چلاتے ہیں یہی تو تلوار

نظر آتے ہیں تعیش کے جو سامان تمھیں! ملک ہیں ان کی درآمد کے یہ ہیں ذمہ دار
بڑھ کے دلال سے ان کی بھی نہیں حیثیت غیر ملکوں کی یہ آڑھت کے ہیں فرماں دار
جیب میں جاتے ہیں اوروں کی منافع سارے ان کو ہے اپنے کمیشن سے غرض اور سرکار
کاروبار اپنا ہے تو اصل ہے اس کی قرضہ آج کل چلتے ہیں اس طرح یہاں کے بیوپار
ہم کو تعلیم جو دی جاتی ہے کچھ ایسی ہے دین و دنیا میں کسی گوں کی نہیں وہ مردار
بھول بیٹھے ہیں بزرگوں کے ہنر اور فنون ایک لے دے کے قلم رہ گیا ان کا ہتھیار
پڑھ کے بن جاتے ہیں دفتر کے ملازم کچھ لوگ لیکن ان عہدوں کا محدود و معین ہے شمار
ایک آسامی کہیں خالی ہو پھر دیکھیں آپ بابو لوگوں کی دورویہ رہ دفتر میں قطار
عرضیاں عرضیوں پر ہیں کہ چلی آتی ہیں منسلک جن سے سفارش کے خطوں کے طومار
لابدی اس کا نتیجہ جو ہے وہ ظاہر ہے دور حاضر سے ہوئے جاتے ہیں سب دل بیزار

ہے حکومت جو تہی دست، رعیت کنگال
کون امداد کرے کس کی؟ سبھی ہیں لاچار (پنڈت دتاتریہ کیفی)

مثال شعر آشوب

تجھ میں اے ہندوستاں کچھ آج کل حد سے سوا چار سو پھیلی ہوئی ہے شاعری کی اک وبا
اس مرض میں اب تو اسی فیصدی ہیں مبتلا مستند شاعر ہے جس نے اک تخلص رکھ لیا

شاعری گو عہد ماضی میں تھی پایان علوم
اب تخلص میں سمٹ کر آ گئی جان علوم

چونک کب تک خواب غفلت میں رہے گی آنکھ بند یہ تغیر دیدۂ عبرت سے دیکھ اے ہوشمند
تھی بنائے قومیت شاعر کی تخئیل بلند قوم اب شاعر بنا لیتی ہے خود حسب پسند

درحقیقت یہ فنائے قوم کے آثار ہیں
قوم میں جب سب کے سب شاعر ہیں جو بیکار ہیں

شکوۂ تعلیم اے ہندوستاں بیکار ہے — تو عرب کی جاہلیت کا علم بردار ہے
تھا زباں سے عشق اس کو تو مگر بیزار ہے — شاعری کا تجھ میں ہر نا اہل دعوٰی دار ہے
تیری اردو نے زمانے بھر کی بازی مات کی
شاعر اسّی فی صدی، تعلیم سو میں سات کی

اے عجائب خانۂ ہستی کی جنس بے بہا — عہد موجودہ کے شاعر واہ کیا کہنا ترا
تیری کثرت ہر جگہ مردم شماری سے سوا — تو فرشتہ ہے بشر کی شکل میں اس عہد کا
تجھ کو کھانے سے نہ کچھ مطلب نہ کچھ پینے سے کام
شعر کہہ کہہ کر سنانے اور فقط جینے سے کام

ہے بہت تکلیف دہ شاعر کی وہ جنس عجیب — جو سنانے کے لئے بے چین رہتا ہے غریب
اس کو اچھا کر نہیں سکتا کوئی کامل طبیب — شاعری کی جس کو بد ہضمی ہو ہیضے کے قریب
چاہتا ہے سب سنا دوں جو کہوں اک سال میں
مبتلائے شاعری ہے سخت تر اسہال میں

جو کہا ہو خود سنا بے فائدہ ڈرتا ہے تو — اس لباس عاریت پر فخر کیوں کرتا ہے تو
زیب جو تجھ کو نہ دے وہ روپ کیوں بھرتا ہے تو — اے حریص شاعری کیوں نام پر مرتا ہے تو
تیرے منہ سے جب سنا جائے کلام غیر صاف
پھر تو ہے بزم سخن میں تو فقط فوٹو گراف

نظم کر لیتا ہے سب کچھ اتنی آسانی کے ساتھ — جس طرح بہتے ہیں تنکے تیز رو پانی کے ساتھ
اور سب منہ دیکھتے ہیں تیرا حیرانی کے ساتھ — شاعری کی کوک ہے تجھ میں سخندانی کے ساتھ
بن رہا ہے تو عالم ایجاد کی ہے وہ مشین
ہر منٹ میں ڈھال دے جو شعر دو دو تین تین

تجھ کو کچھ معنی سے مطلب ہے، نہ کچھ حاصل سے کام — ہے فقط اپنی غزل خوانی سے اور محفل سے کام

جب کر تو لیتا نہیں اپنے دماغ و دل سے کام　　سہل سے ہے تجھ کو مطلب اور کیا مشکل سے کام

شعر کے دامن فقط لفظوں سے بھر دیتا ہے تو
آگیا جو جی میں تیرے نظم کر دیتا ہے تو

سب کو ہے فکر معیشت پر تجھے کیا احتیاج　　بس کہے جا شعر باقی چھوڑ دے سب کام کاج
کہتے کہتے شعر گر ناساز ہو جائے مزاج　　یاد رکھ فکر سخن بالمثل ہے اس کا علاج

یہ غذائے روح ایسی تقویت پہنچائے گی
شعر سننے کو بڑھاپے میں جوانی آئے گی

عالم اسباب میں تو اس قدر بے کار ہے　　تیری ہستی ملک و ملت کے لئے اک بار ہے
جب یہ حالت ہو کہ جس سے زندگی دشوار ہے　　موت ہے پھر شاعری یا کم سے کم آزار ہے

ملک کی ناقدردانی جب ترا دل توڑ دے
ہوش میں آ ہوش میں! یہ فکر باطل چھوڑ دے　　(ظریف لکھنوی)

ہجو جن فضائل و مناقب پر قصیدے کی بنیاد قائم ہے، ان ہی کے سلب کرنے کا نام ہجو ہے ہجو میں ہمیشہ اصلی اور سچے عیوب کا ذکر ہوتا ہے تاکہ ہر شخص ان کی تصدیق کر سکے۔

شریف اور بلند رتبہ اشخاص کی ہجو میں تصریح کی بجائے صرف تعریض سے کام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ صریح ہجو کا، فوری اثر اگرچہ انسان پر شدت کے ساتھ پڑتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ وہ بھول جاتا ہے، اور کوئی شخص اس کو یاد نہیں رکھتا۔ اس کے برخلاف تعریض میں زیادہ وسعت پائی جاتی ہے، اور انسان کو چونکہ وہ صریحاً عیب نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے وہ ہمیشہ اس کے معلوم کرنے کی فکر میں مصروف رہتا ہے اور اس کے مختلف پہلو نکالتا ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص نہایت غبی اور بے حس ہے تو اس پر تعریض کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس لئے اس کی ہجو میں صرف تصریح سے کام لیا جاتا ہے۔ ہجو کا طرز بیان مہذب اور متین ہونا چاہئے۔ اردو زبان میں مرزا سودا اور انشا نے زیادہ ہجویں لکھی ہیں، لیکن ان میں فحاشی اور بدزبانی سے اس قدر کام لیا گیا ہے کہ

وہ مہذب مجلسوں میں پڑھنے کے قابل نہیں ہیں۔

مثال

در ہجو دولتمند بخیل

ہے خدا کا یہ ایک شمۂ نور — جس سے روشن ہے آسماں کا تنور
کس زباں سے ہو اُس کا شکر ادا — نعمتیں کیا کیا اُس نے کیں پیدا
میوے ہیں باغ میں زمانے کے — واسطے کھانے اور کھلانے کے
فضل سے اس کے کچھ نہیں ہے کمی — لیک وہ کیا کرے جو ہم ہوں دنی
سنیو یارو! کروں ہوں میں اک نقل — جس کو باور کرے نہ ہرگز عقل
اتفاقاً اک آشنا میرے — گئے تھے ایک عمدہ کے ڈیرے
جوں ہی وارد ہوئے یہ واں ناگاہ — اٹھا چاروں طرف سے ابر سیاہ
ان کے ہوتے جو ابر گھر آیا — صاحب خانہ سخت گھبرایا
نہ خبر ان کی پوچھی نہ احوال — بیٹھتے ہی کیا یہ ان سے سوال
کچھ ہوا پر بھی تم رکھو ہو نگاہ — گھونگھری، پٹو کچھ بھی ہے ہمراہ
بولے یہ مینہ نہ تھا مجھے معلوم — ورنہ لاتا میں ساتھ اے مخدوم
جب نہ سمجھے یہ اس کے رمز کے تئیں — سوجھی یہ بات اس کے تئیں دہیں
جوں لگی ہونے قطرہ افشانی — لا رکھی ان کے آگے بارانی
پھر لگا کہنے یہ بھی اپنے نصیب — آوے مدت کے بعد اپنا حبیب
اور مینہ آسماں یہ برساوے — بھیگتا اپنے گھر کو وہ جاوے
بولے یہ سادگی سے کیا ہے ضرور — بھیگتا جاؤں گا میں اتنی دور
رکھے خالق سلامت آپ کی ذات — نہ کھلے گا تو میں رہوں گا رات
یہ سخن جوں ہی پہنچا اس کے کان — لگی اس کی دہیں نکلنے جان

سنتے ہی اس کے یوں ہوا مضطر
اپنے بیگانے کی رہی نہ خبر

جس کے منھ کی طرف کرے تھا نگاہ
یہی کہتا تھا اس سے بھر کر آہ

کیوں میاں ابر اس قدر چھایا
حرف رہنے کا درمیاں آیا

مضطرب برق سے نہ ہو یوں حال
بادلوں سے جو اس کا تھا احوال

کبھی کہتا تھا یارو انیسل جلاؤ
کبھی کہتا تھا شیخ ڈونڈول بناؤ

کبھی بولے تھا دیکھیو اوپر
آوے ہے آسماں کہیں سے نظر

گاہ بولے تھا ہو جو مہر پدید
کیسی ہو جائے اپنے گھر میں عید

غرض اپنی سی وہ تو کر گذرا
ہو گئی رات لیک منھ نہ کھلا

وقت آیا جب اس کے کھانے کا
مرتکب ہو کے اس بہانے کا

لگا کہنے کہ کوئی ہے حاضر
بولا اس وقت ڈیوڑھی کا ناظر

کہا اس نے کہ بھر کے آفتابا
محل کی جا ضرور میں رکھوا

غرض اٹھ کر چلا وہ جب واں سے
کہہ گیا کان میں یہ مہماں کے

چاہو جو کچھ کہ اب تناول کو
کہہ دو بلوا کے اب بکاول کو

انھوں نے اس کے موجب ارشاد
کی بکاول کے تئیں وہیں فریاد

آیا بعد از سماجت بسیار
انھوں نے پوچھا ہے کچھ اب تیار

بولا تیار تو نہیں ہے کچھ
جاؤں ڈھونڈوں اگر کہیں ہے کچھ

بولے یہ کچھ اگر نہیں تیار
دیکھو ہووے گا مودی سرکار

اس سے تم جا کے جنس منگواؤ
واسطے میرے کچھ تو پکواؤ

لگا کہنے وہ کوئی مانے ہے
آپ ہی بھڑوا خاک چھانے ہے

جب کہ اس کا حساب ہوتا ہے
جان کو وہ بڑوں کی روتا ہے

اور قصاب بھی جب آوے ہے
چھری، لہذا مجھے بتاوے ہے

جب میاں کچھ کو نخرے سے کہتا ہوں
لہو پی پی کے اپنا رہتا ہوں

بخشے ہے مجھ سے یوں وہ دوٗ بہ دو
ہیجو ترکاری کی جگہ کدّو
کوئی شاعر جو یاں گذرتا ہے
میری ہی ہجو وہ بھی کرتا ہے
پیران کا گر آئے وقت طعام
جائے لقمے کے کھائے وہ دشنام
بس کہ مطبخ میں سردی رہتی ہے
ناک باورچیوں کی بہتی ہے
سینے دیگوں کے مارتے ہیں جوش
روتے ہیں ڈھانپ ڈھانپ منھ سرپوش
بسکہ مہمان وعدے سے آیا
کھانا ان میں سے اب نہیں کھایا
اس خجالت سے دیگچے یکسر
سرنگوں ہی پڑے ہیں چولھوں پر
الغرض مطبخ اس گھرانے کا
رشک ہے آبدار خانے کا
اور کیا کیا میں کھولوں اس کے بھرم
کہتے بھی آتی ہے مجھے تو شرم
سنا اس گھر کا یار تو نے حال
مجھ سے کھانے کا پھر نہ کیجو سوال
ایسی ہی بھوک ہے تو میری جان
بندہ خانہ بھی دور نہیں چنداں
بولے یہ خانہ شما آباد
ہے کرم آپ کا تو اس سے زیاد
ہے غنیمت یہاں تو آپ کی ذات
کٹ گئی اب تو باتوں ہی میں رات
غرض اس آشنا نے صبح کو آ
مجھ سے یہ ماجرا تمام کہا

بھیجو یارو! اب ایسے عمدہ پر
لعنت کردگار شام و سحر
(سودا)

اخلاقی اردوٗ زبان میں حالی اور اکبر نے خصوصیت کے ساتھ اس صنف کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ قدما نے بھی اخلاقی مسائل مثلاً ترک دنیا، قناعت، توکل، تواضع، خاکساری، عفو، حلم اور جود و سخا وغیرہ کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ قدما کے بعد متوسطین کا دور شروع ہوا تو شیخ ناسخ، شاہ نصیر، آتش اور ذوق نے نہایت کثرت سے اخلاقی مسائل بیان کئے۔ غالب کے اخلاقی اشعار بھی خاص اثر رکھتے ہیں۔ متاخرین کے دور میں یہ خصوصیت کم ہوگئی۔

البتہ مغربی تمدن و تہذیب نے ملک میں جو عام انقلاب پیدا کیا، اس سے فلسفۂ اخلاق کا نیا باب شروع ہوا۔ جس کے عنوانات آزادی، حق گوئی، اتفاق و اتحاد، اخوت، مساوات، عزم و استقلال اور جد و جہد قرار پائے اور اخلاقی شعرا حالی، اسمٰعیل، شبلی، آزاد وغیرہ نے ان عنوانات پر کثرت سے نظمیں لکھیں۔

مثالیں

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لئے
بنتی نہیں زندگی بے کام کئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح
مُردوں کی طرح جئے تو کیا خاک جئے (حالی)

کوشش میں ہے شرط ابتدا انسان سے
پھر چاہئے مانگنی مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام دست و بازو سے لیا
پائی نہ نجات نوح نے طوفان سے (حالی)

مذموم ہے رمز و طعنہ و کبر و حسد
رکّھو یہ روش کرے جو اللہ مدد
ہم رنگ سے ارتباط با صدق و صفا
بے میل سے احترازِ بے کینہ و کد (اکبر)

ہو علم اگر نصیب تعلیم بھی کر

دولت جو ملے تو اس کو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو
جو اہل ہیں اس کے ان کی تعظیم بھی کر (اکبر)

گزر ناگاہ جو میرا ہوا شہر خموشاں پر عجب نقشہ نظر آیا وہاں شاہانِ عالم کا
کہیں آئینۂ زانوِ سکندر کا شکستہ تھا کسی جانب پڑا تھا کاسۂ سر خاک میں جم کا

(ناسخ)

آج گو اے مہ جبینو! شغل ہے تم کو یہی چہرہ ہے اور آئینہ ہے، زلف ہے اور شانہ ہے
جائے آئینہ ہے کل آئینۂ زانو جدا اور عوض شانے کے ٹکڑے استخوانِ شانہ ہے

(ناسخ)

شاہراہِ ہستی موہوم میں وہ چال چل اپنی آنکھوں کو بچھادیں دوست، دشمن زیرِ پا

(آتش)

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ قناعت بھی بہار بے خزاں ہے

(آتش)

کیوں آنا گراں بار ہے جو زادِ سفر بھی اے راہ روِ ملکِ عدم اٹھ نہیں سکتا

(ذوق)

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات ہنس کر اسے گذار یا رو کر گذار دے

(ذوق)

دنیا کو نہ تو قبلۂ حاجات سمجھ جُز ذکرِ خدا سب کو خرافات سمجھ
ایک لمحہ کسی مردِ خدا کی صحبت آجائے میسّر تو بڑی بات سمجھ

(اسمٰعیل)

خلوت میں بھی لاتے نہیں عاقل اسے منھ پر   جو بات کہ شائستۂ جلوت نہیں ہوتی
ہم کرتے ہیں عادت کی غلامانہ اطاعت   اصلاح پذیر اس لئے عادت نہیں ہوتی
(اسمٰعیل)

نہ سنو گر برا کہے کوئی   نہ کہو گر برا کرے کوئی (غالب)
روک لو گر غلط چلے کوئی   بخش دو گر خطا کرے کوئی (غالب)

ہے سامنے کھلا ہوا امیداں چلے چلو   باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو   ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو (آزاد)

تخئیلی اس میں شاعر کوئی دعویٰ کرتا ہے، اور اس کی کوئی دلیل پیش کرتا ہے یا کسی بات کو معمولی طریقے کے بجائے عمدہ طریقے سے ادا کرتا ہے یا کسی کی مدح و ذم میں کوئی تعجب آمیز مبالغہ کرتا ہے یا کوئی نادر اور اچھوتی تشبیہ ایجاد کرتا ہے۔ اس قسم کی شاعری کو واقعیت سے بہت کم لگاؤ ہوتا ہے۔

مثال

رخصت اے بزمِ جہاں!

رخصت اے بزمِ جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں میں   آہ! اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں
بسکہ میں افسردہ دل ہوں، درخورِ محفل نہیں   تو مرے قابل نہیں ہے، میں ترے قابل نہیں
قید ہے دربارِ سلطان و شبستانِ وزیر   توڑ کر نکلے گا زنجیرِ طلائی کا اسیر
گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے   اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے
مدتوں تیرے خود آراؤں سے ہم صحبت رہا   مدتوں بے تاب موجِ بحر کی صورت رہا
مدتوں بیٹھا ترے ہنگامۂ عشرت میں، میں   روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں، میں

مدتوں ڈھونڈا کیا نظّارۂ گل خار میں
آہ! وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں

چشمِ حیراں ڈھونڈتی اب اور نظّارے کو ہے
آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے

چھوڑ کر مانندِ بو، تیرا چمن جاتا ہوں میں
رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں

گھر بنایا ہے سکوتِ دامنِ کہسار میں
آہ یہ لذت کہاں موسیقیٔ گفتار میں

ہم نشینِ نرگسِ شہلا، رفیقِ گل ہوں میں
ہے چمن میرا وطن، ہمسایۂ بلبل ہوں میں

شام کو آوازِ چشموں کی سلاتی ہے مجھے
صبح، فرشِ سبز سے کوئل جگاتی ہے مجھے

بزمِ ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دلِ شاعر کو لیکن کنجِ تنہائی پسند

ہے جنوں مجھ کو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں میں؟

شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے؟
اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے مجھے؟

طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنجِ عزلت کا ہوں میں
دیکھ اے غافل! پیامی بزمِ قدرت کا ہوں میں

ہم وطن شمشاد کا، قمری کا میں ہمراز ہوں
اس چمن کی خامشی میں گوش بر آواز ہوں

کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لئے
دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لئے

عاشقِ عزلت ہے دل، نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ میں

لیٹنا زیرِ شجر رکھتا ہے جادو کا اثر
شام کے تارے پہ جب پڑتی ہو رہ رہ کر نظر

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود
گُل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود (اقبال)

مذہبی | اردو شاعری میں ایک مدت تک مذہبی خیالات شاعری کے جزو غالب رہے، مرثیہ گوئی کی ابتدا بھی مذہبی خیالات سے ہوئی، اور رفتہ رفتہ اس نے ایک مستقل مذہبی نظم کی صورت اختیار کرلی۔ وَلی کے زمانے سے پیشتر شعرا نے جو کچھ لکھا اس کا بیشتر حصہ مناجات اَوراد، سنّت اور مناقب وغیرہ پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد سوؔدا اور میرؔ وغیرہ نے نعت اور منقبت میں متعدد قصائد لکھے۔ قدما کے تیسرے دور میں انشاؔ نے اس صنف میں زیادہ زورِ طبع صرف

کیا۔ نظیر اکبر آبادی نے بھی بعض آیتوں کے مفہوم کو اپنے انداز میں نظم کیا۔ مومن خاں نے حمد و نعت کے ساتھ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی شان میں بھی طویل قصیدے لکھے ہیں۔ متاخرین کے دور میں یہ لے بہت پست پڑ گئی۔ داغ و تسلیم نے تو عمر بھر نعت و منقبت کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ منشی امیر احمد مینائی نے اخیر عمر میں اس طرف زیادہ توجہ کی اور ایک پورا نعتیہ دیوان مرتب کیا۔ محسن کاکوروی نے تو نعت گوئی کو اپنا خاص فن بنا لیا اور اس حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔

مثال
قصیدۂ نعتیہ

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل — برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل — جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ عمل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی — کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
نہ کھُلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی — پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل
دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن — سینۂ تنگ میں ہے دل گوپیوں کا بے کل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں — تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
جوگیا بھیس کئے چرخ لگائے ہے بھبوت — یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل
ابر بھی چل نہیں سکتا وہ اندھیرا گھپ ہے — برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل
جس طرف سے گئی بجلی پھر اُدھر آ نہ سکی — قلعۂ چرخ میں ہے بھول بھلیاں بادل
آج یہ نشو و نما کا ہے ستارہ چمکا — شاخ میں کاہکشاں کے نکل آئی کونپل
باغ تنزیہہ میں سرسبز نہال تشبیہ — انبیا جس کی ہیں شاخیں، عرفا کونپل
گل خوش رنگ، رسول مدنی و عربی — زیب دامان ابد، طرۂ دستار ازل
نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر — نہ کوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل

اوجِ رفعت کا قمر، نخل دو عالم کا ثمر   بحرِ وحدت کا گہر، چشمۂ کثرت کا کنول

مہرِ توحید کی ضو، اوجِ شرف کا مہ نو

شمعِ ایجاد کی لو، بزمِ رسالت کا کنول   (محسن کاکوروی)

صوفیانہ | اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی جو قدیم زمانے سے فقر و تصوف کا مرکز ہے۔ اس لئے ابتدا ہی سے اس میں صوفیانہ خیالات کی آمیزش ہوئی، لیکن جس زمانے میں اردو شاعری بنی، خواجہ میر درد نے سب سے پہلے اس زبان کو صوفیانہ خیالات سے آراستہ کیا، بلکہ اس زمانے کے تمام شعرا کے کلام بھی صوفیانہ خیالات سے آراستہ ہیں۔ اس کے بعد قدما کا تیسرا دور ہوا تو شاعری فقر و فاقہ سے نکل کر امرا، رؤسا کے دامن میں پرورش پانے لگی۔ دورِ جدید کے شعرا میں حالی، اسمٰعیل، فانی اور اکبر کے کلام میں بھی بہت کچھ صوفیانہ شان پائی جاتی ہے۔ غالب اور شیفتہ کا کلام بھی محاسن شاعری کے ساتھ صوفیانہ خیالات سے مملو ہے۔

مثالیں

ہٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں   ہم آئینے کے سامنے جب جا کے ہو کریں   (درد)

گر دیکھئے تو مظہرِ آثارِ بقا ہوں   اور سمجھئے جوں عکس مجھے محو فنا ہوں   (درد)

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں   ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا   (حالی)

ہر سمت گردِ ناقۂ لیلیٰ بلند ہے   پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا   (حالی)

کرو دل کے ویرانے کی کنج کاوی   دبے اس کھنڈر میں خزانے بہت ہیں   (اسمٰعیل)

آئینہ بن کہ شاہد و مشہود ایک ہے   اس روئے پاک کو نظرِ پاک چاہیے   (اسمٰعیل)

قطرہ، دریائے آشنائی ہے   کیا تری شانِ کبریائی ہے   (فانی)

وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا   نارسائی سی نارسائی ہے   (فانی)

دلِ شکستہ میں رہتا ہے بادۂ عرفاں   سنا ہے ہم نے کہ یہ شیشہ چور ہی اچھا   (اکبر)

یہ دونوں مسئلے ہیں سخت مشکل   نہ پوچھو تم کہ میں کیا اور خدا کیا   (اکبر)

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا (غالب)
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں (غالب)
یاں خار و خس کو بے ادبی سے نہ دیکھنا — ہاں، عالم شہود ہے آئینہ ذات کا (شیفتہ)
سب اس میں محو اور وہ سب سے علاحدہ — آئینے میں ہے آب، نہ آئینہ آب میں (شیفتہ)

فلسفیانہ | اگرچہ اردو زبان میں کوئی خاص شاعر پیدا نہیں ہوا۔ تاہم متعدد شعرا کے یہاں جا بجا فلسفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ فلسفیانہ شاعری میں ثبوت باری، وحدت باری، معاد وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔

مثالیں

جمع میں افراد عالم ایک ہیں — گل کے سب اوراق پر ہم ایک ہیں (درد)
جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا (درد)
چل رہی ہے جس سے جسمانی مشین — کوئی پوشیدہ کمانی اور ہے (اسمٰعیل)
باغباں کی کارفرمائی سے دیتا ہے خبر — گلشن عالم میں چلنا صرصرِ تغئیر کا (اسمٰعیل)
کوئی بانی ہے بیشک محفل زیبائے عالم کا — نہ ہو یوں منتظم مجلس، نہ جب تک مجلس آرا ہو (میر حسن)
تیری حد سے ہے تیرا ادراک ہو سکے ہے — ورنہ اس آدمی سے کیا خاک ہو سکے ہے (میر حسن)
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا (میر)
ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خود مختاری کی — چاہتے ہیں، سو آپ کریں ہیں، ہمکو عبث بدنام کیا (میر)
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے (غالب)
جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے (غالب)

ظرافت | ظرافت میں خوش طبعی کے ساتھ ذہنی چاشنی اور جودت طبع بھی ہوتی ہے۔ اسے سن کر دماغ پر یہ اثر ہوتا ہے کہ چہرے بشروں میں شگفتگی آجاتی ہے اور سامعین ہنس پڑتے ہیں۔ اس کا نشانہ حاضرین میں سے کوئی نہیں ہوتا۔

مثالیں

شمشیرزن کو اب نئے سانچے میں ڈھالئے	شمشیر کو چھپائیے زن کو نکالیے (اکبر)
وہ دل کو محوِ کلیسا بنا کے چھوڑیں گے	اس اونٹ کو خرِ عیسیٰ بنا کے چھوڑیں گے (اکبر)
اسمال نہیں گریجویٹ ہونا اچھا	دل ہونا برا ہے، پیٹ ہونا اچھا (اکبر)
پنڈت ہو کہ مولوی، ہیں دونوں بیکار	انسان کو گریجویٹ ہونا اچھا (اکبر)
ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے	واں کنزسب بلوریں ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے (اقبال)
نظر کو وسعتیں حاصل نہ ہوں گی دوربینوں سے	خدا تک ہو نہیں سکتی رسائی ان مشینوں سے (افسر میرٹھی)

مزاح جب ظرافت میں صرف خوش طبعی ہو تو وہ مزاح ہے۔

مثالیں

انھیں شوق عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی	نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہو کر (اکبر)
کیا لطف میل جول میں کیا تال میل میں	بندوق کی صفت نہیں ہوتی غلیل میں (نوح)
ہمارے میکدے میں محتسب کا ڈر نہیں واعظ	کہ پہلے ہی یہاں حصہ نکل جاتا ہے قاضی کا (ناطق گلاوٹھی)
جب کوئی اونٹ دیکھتا ہے قیس دور سے	چلاتا ہے کہ وہ مری لیلیٰ سوار ہے (احمق پھپھوندوی)

ہزل جب مزاح میں عوامیت اور فحش داخل ہو جائے تو وہ ہزل ہے۔ پرانے زمانے میں میر جعفر زٹلی، چرکین وغیرہ اس رنگ کے کہنے والے گزرے ہیں۔ آج کل یہ متروکات میں داخل ہے۔

مثالیں

شدت تو دیکھئے نہ گئے ہم پولس تلک	آ کر وہ پھر گئے مرے بیت الحزن کے پاس (چرکین)
پیچش کبھی شکم میں، کبھی سدے پڑ گئے	جس دن سے عشق زلف گرہ گیر سے ہوا "
کپڑے چرکین جب بدلتے ہیں	عطر کے بدلے موت ملتے ہیں "
بھڑ مل کبھی، پلید کبھی، اور گر کبھی	لاکھوں خطاب ملتے ہیں سرکار سے ہمیں "

اک بت پستہ دہن کی چشم کا بیمار ہوں   میرے نسخے میں طبیبو! روغن بادام ہو (چرکین)

بذلہ | جب ظرافت میں خوش طبعی کے ساتھ جودت طبع اور فطانت غالب ہو تو وہ بذلہ ہے۔ بذلہ سنج کا رتبہ بہت اعلیٰ ہے۔ وہ ایک قسم کی ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ایجاز اور لفظی رعایت سے مناسب کام لیا جاتا ہے۔

مثالیں

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے یہ جا کے تھانے میں   کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں (اکبر)

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا (اکبر)

ان سے باتیں کیں تصور میں تو یہ ہم پر کھلا   کشور الفت میں ٹیلی فون کا دفتر کھلا (برج موہن لال مجیب)

یہ حسینان جہاں ہیں مالکان نقد دل   ان سے بے شک ٹیکس لینا چاہیے سرکار کو (محمد رفیق بابا)

پند | قادر الکلام شاعر ہنستے ہنساتے ایسی نصیحت کر جاتا ہے کہ مخاطب کو بری نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ اکبر کو اس میں کمال حاصل ہے۔

مثالیں

کیوں کر کہوں طریق عمل ان کا نیک ہے   جب عید میں بجائے سویوں کے کیک ہے (اکبر)

شیخ اپنی رگ کو کیا کریں، ریشے کو کیا کریں   مذہب کے جھگڑے چھوڑیں تو پیشے کو کیا کریں (اکبر)

طنز | جب ظرافت کا نشانہ کوئی خاص قباحت یا عام رجحان ہو تو وہ طنز ہے۔ طنز کے پیش نظر کوئی نہ کوئی اصلاحی مقصد ہوتا ہے۔ خواہ سماجی ہو یا سیاسی یا مذہبی۔ طنزیہ شاعری کا مقصد ناپسندیدگی، بیزاری اور نفرت کا احساس برانگیختہ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن جوش غضب کے ذریعہ نہیں، بلکہ ہنسی اڑا کر۔ اکبر اور ظریف اس رنگ پر خاص قدرت رکھتے ہیں۔

مثالیں

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منھ نہ دیکھا	کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے اسپتال جاکر (اکبر)
خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں	مگر اندھیرے اُجالے یہ چوکتا بھی نہیں (اکبر)
رہتے ہیں بے چین جوبلے کے لئے، دُھن کے لئے	راگنی بے وقت کی ہے اب غزل ان کے لئے (ظریف)
ختم اب اس فقرے پر ہوگی غزل استاد کی	سنئے میں ہوں جانکی بائی الہ آباد کی (ظریف)

صنائع بدائع

وہ علم ہے جس میں کلام کی خوبی اور زینت کے طریقے بیان کئے جائیں۔ ان طریقوں یا امور کا استعمال اس وقت بہتر ہوگا جب کہ کلام پہلے علم معانی اور علم بیان کے قواعد سے مزین ہوچکا ہو۔ اگر کلام ایسا نہ ہوگا تو ان امور کا کلام میں استعمال کرنا ایسا ہے جیسا کسی بدشکل عورت کو زیور اور زرق برق لباس پہنا دیا گیا ہو۔ ان طریقوں کا استعمال ضروری نہیں، بلکہ مستحسن ہے کیوں کہ باوجود پہلی زینت کے اگر یہ زیور بھی اس کے ہمراہ ہوگا تو کلام کی زینت دوچند ہوجائیگی اور اگر یہ نہ ہوگا تو پہلی ہی زینت بہت ہے۔ جیسے اگر خوب صورت عورت کو زیور نہ پہنائیں تو اس کے لئے حسن خداداد کافی ہے۔ ان طریقوں یا امور کو صنائع اور بدائع کہتے ہیں۔

اقسام صنائع

(۱) صنائع معنوی : جن سے معنی میں خوبی پیدا ہو

(۲) صنائع لفظی : جن سے الفاظ میں خوبی پیدا ہو

علم معانی

علم معانی وہ قاعدے بتاتا ہے جن کی رعایت سے کلام مقتضائے حال کے موافق ہوجاتا ہے۔ علم معانی کے دو حصے ہیں (۱) فصاحت (۲) بلاغت

فصاحت فصاحت (۱) کلمہ (۲) جملہ اور (۳) متکلم تینوں میں پائی جاتی ہے۔

(۱) فصاحتِ کلمہ

فصیح کلمہ وہ ہے جو تنافر حروف، قیاس لغوی کی مخالفت اور غرابت سے خالی ہو۔

تنافر حروف | اس کو کہتے ہیں جب کہ کلمہ ایسے حروف سے مرکب ہو، جن کا تلفظ طبع سلیم پر گراں گزرے۔ جیسے کانڑا (کانا کے لئے)

مخالفت قیاس لغوی | کوئی کلمہ لغت کے خلاف استعمال کیا گیا ہو مثلاً (۱) اس کی شکل بدل دی جائے۔ جیسے فصیل کو صفیل پڑھیں (۲) ساکن کو متحرک یا متحرک کو ساکن کر دیں جیسے فُجر کو فُجُر، شَرَف کو شَرْف (۳) مذکر کو مونث یا مونث کو مذکر استعمال۔ جیسے یہ دہی اچھی ہے، یہ طنز اچھا نہیں۔

غرابت | وہ یہ ہے کہ کلمہ غیر مانوس ہو۔ جیسے شُخُل فارسی لفظ ہے۔ اس کے معنی صفیر دبانگ و فریاد وغیرہ کے ہیں۔ لفظ صحیح ہے۔ اہل اردو نے اس کو آج تک استعمال نہیں کیا لیکن کسی نے لکھ دیا۔

ع "شخل گلزار میں بلبل نہ کرے" چوں کہ اس لفظ کا استعمال اردو میں آج تک نہیں ہوا ہے۔ اس لئے اگرچہ صحیح ہے پھر بھی اسے غیر مانوس کہیں گے اور اس کا استعمال جائز نہ ہوگا۔

(۲) فصاحتِ کلام

کلام فصیح وہ ہے جس کے تمام الفاظ فصیح ہوں اور وہ تنافر کلمات ضعف تالیف اور تعقید سے خالی ہو۔

تنافر کلمات | کلام میں چند ایسے فصیح کلمے جمع ہوں کہ ان کا تلفظ ثقیل معلوم ہو، جیسے بکر کی قبر کے قرب میں قبر ہے۔ اس جملے کا ہر لفظ فصیح ہے، لیکن ان کے اجتماع سے ثقالت پیدا ہو گئی ہے۔

ضعف تالیف | کلام کی ترتیب قواعد نحو کے خلاف ہو۔ مثلاً "کہا اس نے کہ کھاؤ تم

کھانا" یہ جملہ اس طرح ہونا چاہیے: اُس نے کہا کہ تم کھانا کھاؤ۔

تعقید اس کے معنی لغت میں گرہ ڈالنا کے ہیں اور اصطلاح میں یہ مراد ہے کہ کسی کلام کے ٹھیک ٹھیک معنی سمجھنے میں دقّت ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) تعقید لفظی (۲) تعقید معنوی

تعقید لفظی کلمات اپنے محل استعمال سے دور ہو جانے کی وجہ سے معنی میں دشواری ہو جیسے ع وصل کے لوٹے مزے اغیار نے۔ اس میں لوٹنا کا فعل جسے آخر میں آنا چاہیے تھا اپنے فاعل سے پہلے آگیا ہے۔ اس طرح ہونا چاہیے تھا

"وصل کے اغیار نے لوٹے مزے"

تعقید معنوی جس میں الفاظ اپنی اپنی جگہ پر صرف ہوئے ہوں، اور پھر کلام کے معنی سمجھنے میں الجھن پڑ گئی ہو۔ جیسے مومن کا یہ شعر ؎

یہ عذر امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا   میں الزام ان کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

شاعر نے دوست سے کہا کہ تو نے آنے کا وعدہ کیا اور نہ آیا۔ اس نے جواب دیا کہ میں طرفین کی دل کی کشش کا امتحان کرنا چاہتا تھا۔ میری کشش تم پر غالب آئی کہ تم کو میرے گھر کھینچ لائی۔ شاعر لاجواب ہو کر کہتا ہے: یہ عذر امتحانِ جذبِ دل الخ شعر میں شاعر کا دوست کے گھر جانا اور دوست کا شاعر کے گھر نہ آنا مذکور نہیں ہے، جس کی وجہ سے تعقید پیدا ہوئی۔

ضعف تالیف اور تعقید لفظی میں فرق ضعف تالیف میں تقدیم و تاخیر خلاف قاعدہ ہوتی ہے۔ اور تعقید لفظی میں قاعدے کے موافق

(۳) فصاحت متکلم

فصیح وہ شخص ہے جو بلا تکلف کلام فصیح کے استعمال کی مہارت رکھتا ہو۔

بلاغت

بلاغت کے لئے فصاحت کا ہونا ضروری ہے۔ بلاغت کلام اور متکلم دونوں میں پائی جاتی ہے۔

بلاغت کلام | کلام فصیح مقتضائے حال کے موافق ہو۔

مقتضائے حال | کسی واقعے کے بیان کے وقت سننے والے کی تین حالتیں ہوتی ہیں:۔

(۱) اس واقعے سے اس کا ذہن خالی ہوگا۔

(۲) اس واقعے کے ہونے اور نہ ہونے میں اس کو شک ہوگا۔

(۳) اس واقعے کا وہ منکر ہوگا۔

ان تینوں صورتوں کو حال کہتے ہیں۔ ہر حالت کے لئے خطاب کا ایک مخصوص طریقہ ہے۔ مثلاً خالی الذہن کے لئے کلام میں تاکید نہ ہونا۔ اور شک کی حالت میں خفیف سی تاکید ہونا اور منکر کے لئے سخت تاکید ہونا۔ اسی کو مقتضائے حال کہتے ہیں۔

متکلم بلیغ | بلیغ وہ شخص ہے جو بے ساختہ بلیغ کلام بولنے پر قدرت رکھتا ہو۔

علم بیان

علم بیان | وہ علم ہے جس سے ایک بات کو کئی طریقوں سے ادا کیا جاتا ہے۔ اس کے چار باب ہیں:۔

(۱) تشبیہ

(۲) استعارہ

(۳) مجاز مرسل

(۴) کنایہ

تشبیہ | لغوی معنی ایک چیز کو دوسری چیز سے مثال دینا۔

ارکان تشبیہ | ارکان تشبیہ پانچ ہیں:۔ (۱) مُشَبَّہ (۲) مُشَبَّہ بِہ (۳) حرف تشبیہ

(۴) وجہ شبہ (۵) غرض تشبیہ۔

مُشَبَّہ وہ ہے جسے اس چیز سے جو اس سے صفت میں زیادہ ہو تشبیہ دیں۔

مُشَبَّہ بِہ جس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہو جو صفت میں مُشَبَّہ سے بڑھ کر ہو اور اس کی قدر بڑھا دے (مشبہ اور مشبہ بہ کو 'طرفین تشبیہ' کہتے ہیں۔

حرف تشبیہ وہ حرف جو ایک چیز کو دوسری چیز سے مانند کرنے کا واسطہ ہو۔ جیسے: مانند، نظیر، عدیل، مشابہ، برابر، جیسا، جوں، مثل وغیرہ۔

وجہ شبہ وہ معنی کہ جس میں یہ دونوں شریک ہیں، اگر یہ نہ پایا جائے، تو ایک، دوسرے سے مشابہت ہی نہ ہو۔

غرض تشبیہ جس لئے ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دی جائے تشبیہ کی غرض کبھی مُشَبَّہ کی رفعت اور حسن، اور کبھی تحقیر اور ذلت اور کبھی رعب وہیبت ہوتی ہے۔

مثال

خالد بہادری میں شیر کے مانند ہے

خالد، مشبّہ، شیر مشبہ بہ، مانند، حرف تشبیہ، بہادری، وجہ شبہ تشبیہ کی غرض بہادری کا اظہار کرنا ہے۔

اقسام تشبیہ

تشبیہ قریب بعض تشبیہیں ایسی ہوتی ہے کہ اس میں مشابہت کی وجہ جلد سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس کو تشبیہ قریب کہتے ہیں۔

تشبیہ بعید بعض تشبیہ ایسی ہوتی ہیں کہ اس میں وہ وجہ بعد تامل کے معلوم ہوتی ہے۔ اس کو تشبیہ بعید کہتے ہیں۔

تشبیہ مفرد جس طرح چہرے کو پھول، آفتاب، مہتاب اور آئینے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

تشبیہ مرکب جس طرح کہا جائے کہ میدان جنگ میں گرد اٹھی، تو اس میں تلواریں اس طرح چمکتی تھیں، جس طرح رات میں ستارے چمکتے ہیں۔

استعارہ

استعارہ چوں کہ مجاز کی ایک قسم ہے، اس لئے پہلے حقیقت اور مجاز کا سمجھنا ضروری ہے۔

حقیقت لفظ کا اس معنی میں استعمال ہونا جس کے لئے وہ وضع کیا گیا ہو حقیقت بمعنی ثابت کے ہے اور اس کلمہ کو جو کہ اپنے معنی موضوع لہ میں مستعمل ہو حقیقت اس واسطے کہتے ہیں کہ وہ اپنے مکان اصلی میں ثابت ہے، اور مکان اصلی کلمہ کا وہ معنی ہے کہ جس کے واسطے وہ لفظ بنایا گیا ہے۔

مجاز لفظ کا اپنے معنی موضوع لہ کے غیر میں استعمال ہونا۔ مجاز مصدر میمی ہے بمعنی اسم فاعل یعنی گزرنے والا۔ اور اس کلمہ کو مجاز اس لئے کہتے ہیں کہ اس نے اپنے مکان اصلی کو چھوڑ دیا ہے۔ جیسے قارورہ جس کے معنی اصل میں شیشی کے ہیں، نہ کہ وہ چیز جو اس میں بھر کر طبیب کو دکھائی جاتی ہے۔ اگر یہ لفظ پہلے معنی میں مستعمل ہو تو حقیقت کہیں گے اور اگر دوسرے معنی میں استعمال کیا جائے تو مجاز کہلائے گا۔

مجاز کی دو قسمیں ہیں (۱) استعارہ (۲) مجاز مرسل

استعارہ حقیقی اور مجازی معنی میں علاقہ تشبیہ کا ہو تو اس کو استعارہ کہتے ہیں۔ جیسے نرگس (آنکھ کے لئے) لغت میں استعارے کے معنی ہیں کوئی چیز مانگی لینا۔

استعارے سے غرض یہ ہوتی ہے کہ مشبہ، عین مشبہ بہ ہے۔ خواہ مشبہ مذکور ہو یا محذوف استعارے کی بحث میں مشبہ کو مستعار لہ، اور مشبہ بہ کو مستعار منہ اور مشبہ بہ کے لفظ کو مستعار اور وجہ مشبہ کو وجہ جامع کہتے ہیں۔

جیسے نرگس، کہ اس لفظ کو مستعار اور معشوق کی آنکھ کو جو کہ مشبہ ہے مستعار لہ اور

نرگس کے پھول کو جو مشبہ بہ ہے مستعار منہ کہیں گے۔ مشبہ کو مستعار لہ اس لئے کہا گیا کہ لفظ کا استعارہ اس کے لئے ہے اور مشبہ بہ مستعار منہ اس سے بنا کہ اس سے یہ لفظ لیا گیا۔

مجاز مرسل | حقیقی اور مجازی معنی میں تشبیہ کے سوا کوئی دوسرا علاقہ ہو۔

تشبیہ اور استعارے میں فرق | تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ کا ہونا ضروری ہے، اور استعارے میں صرف مشبہ یا مشبہ بہ کا ذکر ہوتا ہے۔ استعارہ بھی تشبیہ کی ایک قسم ہے۔ استعارے میں مشبہ کو بعینہٖ مشبہ بہ فرض کر لیا جاتا ہے، یعنی مثلاً زید کو بعینہٖ شیر کہا جاتا ہے۔ اگر ہم یہ کہنا چاہیں کہ فلاں شخص نہایت شجاع و بہادر ہے تو اگر انہیں لفظوں میں اس مضمون کو ادا کریں، تو یہ معمولی طریقہ ادا ہے۔ اسی بات کو اگر یوں کہیں کہ "وہ شخص شیر کے مثل ہے" تو یہ تشبیہ ہوگی، اور معمولی طریقے کی نسبت کلام میں کچھ زیادہ زور پیدا ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس شخص کا مطلق ذکر نہ کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ "میں نے ایک شیر کو دیکھا" اور اس سے مراد وہی شخص ہو تو یہ استعارہ ہے۔

تشبیہ اور استعارے کا فائدہ اور ان کی ضرورت | اکثر موقعوں پر تشبیہ اور استعارے سے کلام میں جو وسعت و زور پیدا ہو جاتا ہے اور کسی طریقے سے نہیں ہو سکتا۔ یہ چیزیں کلام کا زیور ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نظم و نثر اور تحریر و تقریر میں جو کچھ جادوگری ہے، بہت کچھ ان ہی کی بدولت ہے۔ مثلاً اگر اس مضمون کو کہ فلاں موقع پر نہایت کثرت سے آدمی تھے یوں ادا کیا جائے کہ "وہاں آدمیوں کا جنگل تھا" تو کلام کا زور بڑھ جائے گا۔ جنگل کی تشبیہ کی وجہ سے کثرت کا خیال متعدد وجہوں سے زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔

استعارے کی قسمیں

استعارہ مُصَرَّحہ | جس میں مشبہ متروک اور مشبہ بہ مذکور ہوتا ہے۔ مثلاً ؎

کیا مرے حال پہ سچ مچ انھیں غم تھا قاصد — تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی

"ستارہ" مشبہ بہ مذکور اور آنسو جو مشبہ ہے محذوف ہے۔ اس کو استعارہ مصرحہ

اس لئے کہتے ہیں کہ آنسو کے واسطے لفظ ستارہ کا مانگ لینا واضح اور صریح ہے یا مثلاً ؎

جو مجھ پہ گذری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم
چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

"ستارۂ سحری" استعارہ ہے آنسو سے۔

استعارہ بالکنایہ جس میں مشبّہ بہ محذوف اور مشبّہ مذکور ہو مثلاً ؎

جو سوئے جیب ہیں ہم سرنگوں سبب یہ ہے
کہ دل کے زخم کو مژگاں سے ہیں رفو کرتے

مژگاں میں رفو کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اس کو سوزن سے تشبیہ دی ہے، لیکن مشبّہ بہ یعنی سوزن کو ترک کر دیا گیا ہے اور مشبّہ یعنی مژگاں کو مذکور۔ اس کو استعارہ بالکنایہ اس واسطے کہتے ہیں کہ اس کا استعارہ ہونا واضح نہیں ہے اور تصریح نہ کرنے کا نام کنایہ ہے۔

مستعار لہ اور مستعار منہ کے لحاظ سے استعارے کی قسمیں

استعارہ وفاقیہ اگر مستعار منہ اور مستعار لہ ایک شے میں اکٹھے ہو سکتے ہیں، تو اس کو استعارہ وفاقیہ کہتے ہیں۔ مثلاً زندگی کا لفظ کہیں، اور اس سے مراد ہدایت ہو، زندگی اور ہدایت کا ایک شخص میں اکٹھا ہونا ممکن ہے یعنی جائز ہے کہ ایک شخص زندہ ہو اور ہدایت یافتہ بھی ہو۔ اس استعارے کو وفاقیہ اس لئے کہتے ہیں کہ وفاق کے معنی موافقت کرنے کے ہیں، اور اس استعارے میں بھی مستعار منہ اور مستعار لہ ایک شخص میں اکٹھے ہو گئے ہیں۔ گویا ان دونوں میں موافقت ہے۔

استعارہ عنادیہ اگر مستعار منہ اور مستعار لہ ایک شے میں اکٹھا نہیں ہو سکتے تو اس کو استعارہ عنادیہ کہتے ہیں مثلاً کسی مردہ شخص کو بہ سبب نیک نام اور شہرت کے زندہ کہا جائے جیسے ع

"نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گزاشت" اس کو عنادیہ اس لئے کہتے ہیں کہ عناد کے معنی دشمنی کے ہیں اور مستعار منہ اور مستعار لہ یعنی موت اور زندگی ایک شخص میں جمع

نہیں ہوسکتی۔ گویا ان دونوں میں دشمنی ہے۔

مجاز مرسل

حقیقی اور مجازی معنی میں تشبیہ کے سوا کوئی دوسرا علاقہ ہو۔ مجاز مرسل کے مشہور علاقے یہ ہیں:۔

(۱)	جزو کہہ کر کل مراد لینا	جیسے	مجھے اپنا چہرہ دکھاؤ	یعنی مجھ سے ملو
(۲)	کل کہہ کر جزو مراد لینا	جیسے	کانوں میں انگلیاں رکھ لو	یعنی پوریاں
(۳)	سبب کہہ کر مسبب مراد لینا	جیسے	ابر برسا	یعنی بارش ہوئی
(۴)	مسبب کہہ کر سبب مراد لینا	جیسے	گرم و سرد زمانہ دیکھا	گرم و سرد مسبب ہے اور انقلاب سبب یعنی انقلاب دیکھا۔
(۵)	ظرف کہہ کر مظروف مراد لینا	جیسے	قارورہ	اس کے لغوی معنی شیشی کے ہیں، لیکن اس سے مراد پیشاب ہے۔
(۶)	مظروف کہہ کر ظرف مراد لینا	جیسے ؎	نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مزا تو جب ہے کہ گرتے کو تھام لے ساقی ظاہر ہے کہ نشہ شراب میں ہوتا ہے، اور شراب پی جاتی ہے۔	
(۷)	لازم کہہ کر ملزوم مراد لینا	جیسے	انگیٹھی میں حرارت باقی ہے	یعنی آگ باقی ہے
(۸)	ملزوم کہہ کر لازم مراد لینا	جیسے	تن بدن میں آگ لگ گئی	یعنی حرارت پیدا ہوگئی
(۹)	عام بجائے خاص استعمال کرنا	جیسے	بڑا اچھا جانور ہے	(کسی گھوڑے کو دیکھ کر)
(۱۰)	خاص بجائے عام استعمال کرنا	جیسے	یہ یوسف ہے	(کسی خوبصورت کو دیکھ کر)

(۱۱) کسی چیز کو بہ لفظ آلہ استعمال کرنا جیسے ؎ اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

(۱۲) کسی چیز کو اس کے مادے کے نام سے ذکر کرنا جیسے اچھا لوہا ہے (تلوار کے لئے)

کنایہ

کنایہ | لغت میں پوشیدہ سخن کہنے کو کہتے ہیں یعنی بات کھول کر نہ کہنے کو۔ اصطلاح میں اس کو کہتے ہیں کہ لفظ اپنے وضعی معنی میں مستعمل نہ ہو، بلکہ لازم معنی میں مستعمل ہو ہاں وضعی معنی بھی لئے جا سکتے ہیں جیسے ؎

اٹھا جو ہاتھ کانپ گیا شیر آسماں　　گردش جو دی تو سب تہ و بالا ہوا جہاں

شیر آسماں، برج اسد سے کنایہ ہے۔

تعریض | اگر کنائے میں موصوف مذکور نہ ہو تو اس کو تعریض کہتے ہیں۔ جیسے عمل نہ کرنے والے عالم کو کہا جائے " عالم وہ ہے جو علم پر عمل کرے " اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ عالم نہیں ہے۔

تلویح | اگر کنائے میں لازم سے ملزوم تک بہت واسطے ہوں تو اس کو تلویح کہتے ہیں جیسے کسی سخی آدمی کو کہیں "کثیر الرماد" یعنی بہت راکھ والا۔ اس مثال میں ملزوم تک بہت واسطے ہیں۔ اس لئے کہ بہت راکھ، بہت لکڑی جلنے سے ہوتی ہے اور لکڑیوں کا بہت جلنا، بہت کھانا پکنے سے ہوتا ہے اور بہت کھانا پکنا، مہمانوں کی کثرت پر موقوف ہے اور مہمانوں کی کثرت، سخاوت پر موقوف ہے۔ یا جیسے ٹھنڈے چولھے والا کنایہ ہے بخیل سے یعنی ٹھنڈے چولھے کو لازم ہے کھانا نہ پکنا، اور کھانا نہ پکنے کو لازم ہے مہمان کا نہ آنا اور مہمان کے نہ آنے سے بخل ثابت ہوتا ہے۔

رمز | اگر کنائے میں لازم سے ملزوم تک واسطے بہت ہیں، لیکن کچھ تھوڑی سی پوشیدگی ہے تو اس کو رمز کہتے ہیں۔

جیسے ؎ سیاہی مو کی گئی، دل کی آرزو نہ گئی ہمارے جامۂ کہنہ سے مے کی بو نہ گئی

جامۂ کہنہ سے شراب کی بو نہ جانا، کنایہ ہے اس سے کہ بڑھاپے تک مے خواری کرتے رہے۔

ایما و اشارہ اگر کنائے میں زیادہ واسطے نہ ہوں اور پوشیدگی بھی نہ ہو تو اسے ایما و اشارہ کہتے ہیں۔ جیسے ؎

شرکت شیخ و برہمن سے میرؔ اپنا کعبہ جدا بنائیں گے

کعبہ جدا بنانا علاحدگی اختیار کرنا کے معنی دیتا ہے۔

صنائع معنوی

تضاد کلام میں دو متضاد الفاظ کا ذکر کرنا۔ اس کو طباق، مطابقت، تطبیق اور تکافو بھی کہتے ہیں۔ جیسے ؎

مری قدر کر اے زمینِ سخن کہ میں نے تجھے آسماں کر دیا

مراعات النظیر کئی چیزیں جن میں مناسبت ہو ایک کلام میں ذکر کرنا۔ جیسے ؎

روح کس مست کی پیاسی گئی مے خانے سے مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

مست، مے خانہ، ساقی اور پیمانہ ایسے الفاظ ہیں جو آپس میں مناسبت رکھتے ہیں۔

ایہام لغت میں اس کے معنی وہم میں ڈالنے کے ہیں۔ اصطلاح شعرا میں یہ معنی ہیں کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں ایک قریب اور ایک بعید۔ سننے والے کا ذہن معنی قریب کی طرف جائے، مگر شاعر کا مقصد اس سے معنی بعید ہو۔ لیکن مقدم اور مؤخر الفاظ اس کو مناسبت ہو۔ اس کو توریہ بھی کہتے ہیں۔ جیسے ؎

زندہ در گور کرتے ہیں یہ بت خاک پتھر نباہ کرتے ہیں

یہاں خاک پتھر کے لفظی معنی سے غرض نہیں، بلکہ مراد نفی سے ہے یعنی کچھ نباہ نہیں

گرتے، اور گور سے خاک پتھر کو مناسبت بھی ہے۔

لفّ ونشر | لغت میں لف کے معنی لپیٹنا اور نشر کے معنی پھیلانا، کھولنا کے ہیں۔

اصطلاح شعرا میں یہ مراد ہے کہ پہلے چند چیزوں کا ذکر مجمل کیا جائے، پھر ان کی خبریں یا صفتیں یا ہر ایک کے منسوبات اور متعلقات بیان کریں۔ یہ ہوا نشر۔

اس کی دو قسمیں ہیں (۱) مرتّب (۲) غیر مرتّب

لفّ ونشر مرتب | مناسبات کو مذکورہ چیزوں کی ترتیب کے لحاظ سے بیان کرنا

جیسے ؎

دیکھ اُسے رنگِ بہار و سرو و گل اور جوئبار
اک اڑا، اک گر گیا، اک جل گیا، اک بہہ گیا

مدّعا ظاہری و باطنی اپنا ہے یہی
چشم بیدار ملے، اور دل آگاہ ملے

تیرے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار
گل جدا، سرو جدا، نرگس بیمار جدا

رنگ کی نسبت سے اڑ گیا، سرو کی نسبت سے گر گیا، گل کی نسبت سے جل گیا اور جوئبار کی نسبت سے بہہ گیا۔

مدعا ظاہری کی نسبت سے چشم بیدار اور باطنی کی نسبت سے دل آگاہ، رخسار کی نسبت سے گل کا بیان کیا، قد کی نسبت سے سرو کا، اور چشم کی نسبت سے نرگس کا۔ رخسار پہلے تھا، اس لئے دوسرے مصرعے میں گل پہلے لائے، اس کے بعد قد تھا، اس لئے سرو لائے، تیسرا نمبر آنکھ کا تھا، اس لئے دوسرے مصرعے میں تیسرے نمبر پر نرگس کو لائے۔

لفّ ونشر غیر مرتب | مناسبات کو بے ترتیب بیان کرنا جیسے ؎

یاد میں اس طرہ و رخسار کی
ہاتھ سر پر مارتا ہوں صبح و شام

شام، طرہ کی ترتیب کے لحاظ سے صبح سے پہلے آنی چاہیے تھی، لیکن ضرورت شعری کی وجہ سے بعد میں آئی۔ ؎

شرمندہ ہے زلف و رخ و قامت سے چمن میں، گلبرگ تر و سرو سہی سنبل سیراب

تو پہلے سنبل سیراب، پھر گلبرگ تر، پھر سرو سہی بیان کرنا تھا۔

حسن تعلیل | یہ ایک لطیف صنعت ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ شاعر ایک ایسی چیز کو کسی چیز کی علّت فرض کرتا ہے جو در حقیقت اس کی علّت نہیں جیسے ؎

ڈر سے ہوا فرات کی موجوں کو اضطراب اور آب میں سروں کو چھپانے لگے حباب

موجوں کے اضطراب، اور حباب کے پانی میں سر چھپانے کی علّت ڈر اور خوف کو قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ ان کی یہ علّت نہیں ہے۔

صنعت مبالغہ | لغوی معنی کسی کام میں سخت کوشش کرنا، اور اصطلاح میں کسی کی تعریف یا مذمت ایسی کرنا جو محال ہو۔

مبالغہ کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) تبلیغ (۲) اغراق (۳) غلو

مبالغہ تبلیغ | جو عقل اور عادت کے موافق ہو۔ جیسے ؎

سنبھل سکتا نہیں ہے سر، فور ناتوانی سے اگر تکیے سے اٹھتا ہے، تو آرہتا ہے زانو پر

ممکن ہے کوئی اس حد کا ناتواں ہو

مبالغہ اغراق | جو عقل کے رو سے ٹھیک اور عادت کے لحاظ سے خلاف ہو جیسے ؎

آشیان عقاب و شاہیں میں روز گنجشک کی ہے مہمانی

گنجشک کی مہمانی عقاب و شاہین کے آشیانے میں عقلاً ممکن ہے اور عادۃً محال۔

مبالغہ غلو | جو عقل اور عادت دونوں لحاظ سے خلاف ہو جیسے ؎

گوش گل میں ابھی ہو جائے سماعت پیدا دیدۂ نرگس شہلا کو ہو یارائے نظر

گوش گل میں سماعت کا پیدا ہونا اور دیدۂ نرگس میں بصارت کا آنا نہ عقلاً

ممکن ہے نہ عادۃً۔

تلمیح | لغت میں تلمیح کے معنی نظر کرنا۔ اصطلاح میں کسی قصّے یا تاریخی واقعے کی طرف اشارہ کرنا جیسے ؎

طور کیوں خاک ہوا، نور ترا نار نہ تھا ــــ ناز تھا حضرت موسیٰؑ سے وہ دیدار نہ تھا

حضرت موسیٰؑ کے قصّے کی طرف اشارہ ہے۔

تلمیع | متعدد زبانوں کے جمع کر دینے کو تلمیع کہتے ہیں۔ یعنی ایک بیت میں دو زبانیں ہوں اور مخمس میں پانچ جیسے ؎

بادِ صبا بہ کوچۂ جاناں جو بگزری ــــ کہہ دینا واں پہ حال ہمارا ابھی سرسری

اشتقاق | ایسے چند الفاظ استعمال کرنا جو ایک ہی مصدر سے مشتق ہوں جیسے ؎

سوائے اہل سخن ہو مشاہدہ کس کو ــــ نہاں ہے شاہد معنی سخن کے پردے میں

توجیہہ | کوئی بات اس طرح کہنا کہ ہجو اور تعریف دونوں معلوم ہو۔ اس کو محتمل الضدین بھی کہتے ہیں جیسے ؎

جب سنبھالا اس پری پیکر نے کچھ حسن شباب ــــ شیعہ، سنّی ہو گئے، ہندو مسلماں ہو گئے

مصرع آخر سے دو پہلو نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شیعہ، سنّی ہو گئے اور ہندو مسلمان ہو گئے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان، ہندو ہو گئے، اور سنّی، شیعہ ہو گئے۔

ہجو ملیح | ایسے الفاظ میں ہجو کریں کہ بہ ظاہر مدح معلوم ہوتی ہو اور حقیقت میں ہجو ہو۔ اس کو تاکید الذم بما یشبہ المدح بھی کہتے ہیں ؎

فلک بے بہرۂ آب و خور سے کب رکھے غریبوں کو ــــ سدا کھانے کو غم، خونِ جگر پینے کو دیتا ہے

آب و خورش سے بے بہرہ نہ رکھنا مدح ہے، لیکن جب دوسرے مصرعے میں کہا کہ کھانے کو "غم"، اور پینے کو "خونِ جگر" دیتا ہے، تو یہ مدح بعینہٖ ہجو بن گئی۔

مدح صبیح | ایسے الفاظ میں مدح کریں جس پر ہجو کا شبہہ ہو۔ اس کو تاکید المدح بما یشبہ الذم

بھی کہتے ہیں جیسے ؎

نہیں ہے مجھ میں برائی کچھ اور اس کے سوا ۔۔۔ کہ میں برا ہوں رقیبوں کی چشم بد بیں میں

کسی کی آنکھوں میں برا ہونا ، برا ہے ، لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ یہ شخص رقیبوں کی آنکھوں میں برا ہے تو معلوم ہوا کہ فی الواقع اچھا ہے۔ کیوں کہ رقیب دشمنی کی بنا پر برا سمجھتے ہیں۔

رجوع | ایک بات کہہ کر کسی نکتے کی وجہ سے اس سے انکار کرنا اور دوسری نکتہ آمیز بات کہنا جیسے ؎

قد ہے تیرا اک صنوبر باغ عالم میں ولے ۔۔۔ راستی جو ہے ترے قد میں صنوبر میں کہاں

اس میں رجوع کا فائدہ معشوق کے قد کی خوبی کا اظہار ہے۔

جمع | چند چیزوں کو ایک حکم میں جمع کر دینا جیسے ؎

درازیٔ شب ہجراں و زلف یار کلیم ۔۔۔ مجھی سے پوچھ کہ کاٹی ہے رات آنکھوں میں

شب ہجراں اور زلف یار کو درازی کے حکم میں جمع کر دیا ہے۔

تفریق | ایک قسم کی دو چیزوں میں فرق ظاہر کرنا جیسے ؎

اے ابر! قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے ۔۔۔ ٹپکا تری آنکھوں سے کبھی لخت جگر بھی

آنکھ اور ابر پانی کے گرانے میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، لیکن ان میں باعتبار لخت جگر ٹپکنے کے فرق ظاہر کیا ہے۔

جمع تفریق | پہلے چند چیزوں کو ایک حکم میں جمع کر کے ، پھر ان میں فرق بیان کرنا جیسے ؎

دل و مسجد ہیں دونوں گھر خدا کے فرق پر یہ ہے ۔۔۔ وہ تعمیر اس کے ہاتھوں کی، یہ تعمیر اپنے ہاتھوں کی

تقسیم | پہلے چند چیزیں بیان کر کے پھر ان کے مناسبات تعین کے ساتھ بیان کرنا۔ جیسے ؎

وہی دیوے گا مجھے صبر و سکوں جس نے دیا ۔۔۔ رخ زیبا تجھے اور دیدۂ گریاں مجھ کو

رخ زیبا اور دیدۂ گریاں مورد قسمت ہیں۔

تقسیم اور لف و نشر میں فرق یہ ہے کہ تقسیم میں تعین کر دیا جاتا ہے اور لف و نشر میں تعین نہیں کیا جاتا۔

جمع تقسیم | صنعت جمع اور صنعت تقسیم کے اکٹھا کرنے کو کہتے ہیں۔ جیسے ؎

تجھے اور تیرے دشمن کو سدا ہے اوج عالم میں　　تجھے تخت خلافت پر، اسے دار سیاست پر

پہلے مصرعے میں صنعت جمع، اور دوسرے مصرعے میں صنعت تقسیم ہے۔

تجاہل عارفانہ | ایک چیز کو جاننے کے باوجود کسی نکتے کے باعث اس سے لاعلمی ظاہر کرنا۔ جیسے ؎

موت کا ایک دن معین ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

شاعر کو معلوم ہے کہ نیند کا نہ آنا اضطراب کی وجہ سے ہے، لیکن تجاہل کر کے بے خوابی کا سبب دریافت کرتا ہے

براعت استہلال | شاعر قصیدے کے مطلع میں ایسا لفظ لے آئے جس سے قصیدے میں جو بات بیان کرنی ہے اس کی طرف اشارہ ہو جائے۔ لغت میں استہلال پیدائش کے وقت بچے کے رونے کو کہتے ہیں۔ جس طرح بچے کے رونے سے پہچان لیا جاتا ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ اسی طرح اس صنعت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس قصیدے کا کیا مضمون ہے۔ اس کو صنعت چہرہ بھی کہتے ہیں۔ جیسے ؎

اے شہنشاہ آسماں اورنگ　　اے جہاں دار آفتاب آثار

شاعر نے آفتاب کا لفظ لا کر اشارہ کر دیا کہ اسے بادشاہ سے موسم سرما کی شکایت کرنی ہے۔

صنائع لفظی

تجنیس | دو لفظ، تلفظ میں مشابہ اور معنی میں متغائر ہوں۔ اس کی دس قسمیں ہیں:-

(۱) تجنیس تام　(۲) تجنیس ناقص　(۳) تجنیس زائد　(۴) تجنیس مذیل

(۵) تجنیس مرکب (۶) تجنیس مکرر (۷) تجنیس مطرف (۸) تجنیس خطی
(۹) تجنیس مضارع (۱۰) تجنیس قلب

تجنیس تام | دو لفظ شمار، حروف، حرکات اور ترتیب میں متفق ہوں اور معنی میں متغائر۔ جیسے ؎

ہوگی ہماری جیت رقیبوں کی ہار کب ہاتھوں سے اپنے تم کو پہنائیں گے ہار کب

پہلے مصرعے میں "ہار" بمعنی شکست اور دوسرے مصرعے میں "ہار" بمعنی پھولوں یا موتیوں کی مالا۔

تجنیس ناقص | جب حروف ایک ہی ہوں، لیکن حرکات میں اختلاف ہو تو اسے تجنیس ناقص کہتے ہیں۔ جیسے ؎

یہ بھی نہ پوچھا کبھی صیّاد نے کون رَہا، کون رِہا ہو گیا

رَہا اور رِہا میں تجنیس ناقص ہے۔

تجنیس زائد | دو متجانس لفظوں میں سے ایک میں ایک حرف زیادہ ہو۔ شروع میں یا درمیان میں یا آخر میں۔ جیسے ؎

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میرؔ کس بھروسے پہ آشنائی کی

زور اور زر میں تجنیس زائد ہے۔

تجنیس مذیل | دو متجانس لفظوں میں سے ایک میں دو حرف زائد ہوں۔ جیسے ؎

چشم غضب سے نیم نگہ میرے واسطے اک نیمچہ ہے زہر میں گویا بجھا ہوا

نیم اور نیمچہ میں تجنیس مذیل ہے۔

تجنیس مرکب | دو متجانس لفظوں میں سے ایک مفرد، دوسرا مرکب ہو۔ جیسے ؎

فقط موتیوں کی پڑی پائے زیبا کہ جس کے قدم سے گہر پا ئے زیب

پہلا پائے زیب مفرد ہے، جو ایک زیور ہے اور دوسرا مرکب ہے پا سے اور زیب سے

تجنیس مکرر | دو متجانس لفظ بلا فصل واقع ہوں۔ جیسے ؎

ہم سے کیوں رکھتا نہیں ہے، وہ بت خودکام کام — جس نے اپنا کر دیا ہر ایک پر انعام عام

خودکام اور کام میں تجنیس مکرّر ہے۔

تجنیس مطرف | جب دو لفظوں میں آخری یا ابتدائی حروف مختلف ہوں۔ جیسے ؎

ذوق ہے اس کو خود آرائی سے، خود بینی سے شوق — آئینہ زانو پہ ہے، زلف معنبر ہاتھ میں

ذوق اور شوق میں تجنیس مطرف ہے۔

تجنیس خطی | دو متجانس لفظوں میں صرف نقطوں کا اختلاف ہو۔ جیسے ؎

گر کمر باندھے نظر کے تار سے — یہ بھی اس نازک بدن کو بار ہو

بار اور تار میں تجنیس خطی ہے۔

تجنیس مضارع | دو متجانس لفظوں میں ایک حرف قریب المخرج ہو۔ جیسے ؎

ہاتھ میں تسبیح، زباں پر عمل — قطع مگر رشتۂ طول امل

عمل اور امل میں تجنیس مضارع ہے۔

تجنیس قلب | دو متجانس لفظ ترتیب میں مختلف ہوں۔ اس کی چار قسمیں ہیں:۔

(۱) قلب کل (۲) قلب بعض (۳) قلب مستوی (۴) قلب مجنح

قلب کل | کلمہ کے تمام حروف علی الترتیب مقلوب ہوں۔ جیسے ؎

دنیا میں ہے خزانہ، لڑائی کا گھر سدا — از روئے غور گنج کو الٹو تو جنگ ہے

گنج اور جنگ میں قلب کل ہے۔

قلب بعض | اگر کلمہ کے حروف علی الترتیب مقلوب نہ ہوں تو اس کو قلب بعض کہتے ہیں۔ جیسے ؎

قوت ملت و دیں، قامع کفر و الحاد — حامی شرع نبی، ماحی شرک و بدعت

حامی اور ماحی میں قلب بعض ہے۔

قلب مستوی | کسی لفظ یا جملے کے حروف کی ترتیب الٹ دینے سے وہی لفظ یا جملہ حاصل ہو۔ جیسے ؎

ع "اوّل کلام یہ ہے، یہ ہے مالک لوا"

ع "شکر بترا ز وئے وزارت برکش"

قلب مجنح | الفاظ مقلوب میں سے ایک شعر کے اوّل میں واقع ہو اور دوسرا شعر کے آخر میں۔ جیسے ؎

رام ہوتا نہیں فسوں سے بھی ہے وہ کافر تمھاری زلف کا مار

رام اور مار میں قلب مجنح ہے۔

رد العجز علی الصدر | دوسرے مصرعے کے آخر میں وہی لفظ لانا جو پہلے مصرعے کے شروع میں ہو۔ جیسے ؎

خط نامہ بر کو پھیر دیا اور یہ کہا کہنا کہ ہم نے جان لیا مدعائے خط

لزوم مالایلزم | کسی غیر لازم امر کو لازم کرلینا۔ جیسے ؎

ہے مجھے ابر و ہوا شیشہ و جام اے ساقی گریۂ و نالہ، دل و دیدۂ نم چاروں ایک

اس قصیدے میں سودا نے چار چیزوں کے ذکر کا التزام کیا ہے۔

سیاق الاعداد | شعر میں اعداد بیان کریں۔ خواہ بالترتیب خواہ بغیر ترتیب: جیسے ؎

چہرۂ مہروش ہے ایک، سنبل مشک فام دو حسنِ بتاں کے دور میں ہے سحر ایک شام دو

تنسیق الصفات | ایک موصوف کی چند صفتیں پے در پے بیان کرنا۔ جیسے ؎

ہے ہے مرے سعید و رشید و متیں جواں خوش رو جواں، غریب جواں، مہ جبیں جواں

توشیح | نظم کے اشعار کے دونوں مصرعوں کے حروف اوّل کو جمع کریں تو کوئی خاص نام یا تاریخ نکلے۔ جیسے:۔

کرچکا جب تمام میں یہ کتاب ایسی تاریخ کا خیال ہوا

نام ہو ساتھ ایک صنعت کے — تاکہ شائق جہان ہو اس کا
اس لئے لکھ کے قطعۂ تاریخ — رغبت دل سے خوب غور کیا
یک بہ یک یہ بہ صنعت توشیح — خوب برجستہ نام ہاتھ آیا

ہر مصرع کا حرف اوّل جمع کریں، تو "کان تاریخ" نام نکلتا ہے۔

ترصیع ہر مصرع کے رکن اوّل کا قافیہ دار ہونا۔ جیسے ؎

مطلع ہو جواب مطلع نور — مصرع ہو نظیر شعلۂ طور

موصّل سارے حروف لکھنے میں ملے ہوئے ہوں۔ جیسے ؎

غم فرقت سے کوفت ہے جی پر — ہم سے غافل ہے توبتِ کافر

مقطع سارے حروف لکھنے میں علاحدہ ہوں۔ جیسے ؎

درد و داغ و رخِ زرد اور وہ دل — فیض مٹی میں گئے ہیں سب مل

پہلے مصرع میں صنعت مقطع اور دوسرے مصرع میں صنعت موصّل ہے۔

منقوطہ شعر میں سب حروف نقطہ دار ہوں۔ جیسے

ع بخشش فیض جشن تخت نشین

غیر منقوطہ شعر میں سب حروف بے نقطہ ہوں۔ جیسے

ہو سرور اور کو مہِ کامل — دکھ ہو اور درد ہو سواس دل کو

رقطا شعر یا مصرع کا ایک حرف نقطہ دار ہو اور ایک بے نقطہ ہو۔ جیسے:

ع کیا قرب کیا بعید یہ پرسش عذاب ہے

خیفا کلام میں ایک لفظ نقطہ دار اور ایک لفظ بے نقطہ ہو۔ جیسے ؎

شب کو جشن سرور تخت رہا — کار فیض مدار بخت رہا

فوقانیہ جس کے کسی لفظ میں نقطہ نیچے نہ آئے جیسے:۔

ع "خدا خود رزق کا ضامن ہوا تھا"

تحت النقاط | جس میں کسی لفظ کے اوپر نقطہ نہ آئے۔ جیسے:۔

ع "ہوا کے گھوڑے پر بادل سوار آیا ہے"!

معکوس | اس کی تین صورتیں ہیں:۔

(۱) دو لفظ ایسے ہوں کہ الٹنے سے ایک دوسرے کے موافق بن جائیں، جیسے:۔

ع "زار ہوں راز دل چھپاؤں کیا"!

(۲) دو لفظ ایسے ہوں کہ بے ترتیب الٹنے سے ایک دوسرے کے موافق بن جاتے ہیں۔ جیسے ؎

ادنیٰ سا یہ ہے کمال مضموں　　کانٹے کا تُلا کلام موزوں

کمال کو بے ترتیب الٹو تو کلام بن جاتا ہے، اور کلام کو بے ترتیب الٹو تو کمال بن جاتا ہے۔

(۳) دو لفظ ایسے ہوں کہ الٹنے سے بھی وہی لفظ بن جائیں۔ جیسے:۔

ع "قلق کیوں کرنہ ہو دل موم سا ہے"!

قلق کو الٹو تو قلق ہی رہے گا اور موم کو الٹو تو موم ہی رہے گا۔

عروض کا معمولی تصوّر

عروض | شعر کے وزن میں کبھی غلطی واقع ہو جاتی ہے۔ اس واسطے چند قاعدے مقرر کئے گئے ہیں، جن سے شعر کا موزوں اور غیر موزوں ہونا معلوم ہو جاتا ہے، ان قواعد کا نام فن عروض ہے۔ عروض کا موجد عرب کا ایک عالم ادب خلیل احمد ابن مکّی ہے۔

وزن | وزن عروضیوں کی اصطلاح میں: دو کلموں کی حرکات و سکنات برابر ہونے کا نام ہے۔ حرکات اور حروف کا اختلاف ہو تو حرج نہیں۔ جیسے اقبال اور مکتوب ہم وزن

ہیں یعنی جتنی حرکتیں اور سکون ایک میں ہیں اتنے ہی دوسرے میں ہیں، اگرچہ دونوں کی حرکتیں مختلف ہیں۔

بحر شعر جس وزن پر ہوتا ہے، اس وزن کو اصطلاح میں بحر کہتے ہیں۔

ارکان بحر بحر جن اجزا (ٹکڑوں) سے بنتی ہے، ان کو ارکان کہتے ہیں اور ہر جزو کو رکن اور پہلے مصرعے کے پہلے رکن کو "صدر" اور آخری رکن کو "عروض" اور درمیان میں آنے والے ایک یا دو یا زیادہ رکنوں کو "حشو" کہتے ہیں۔ دوسرے مصرعے کے پہلے رکن کو "ابتدا" آخری رکن کو "عجز" اور درمیانی کو حشو کہتے ہیں۔

مثال

صدر	حشو (مصرعۂ اوّل)	عروض	ابتدا	حشو (مصرعۂ دوم)	عجز

ان ارکان سے اُنیس بحریں نکالی گئی ہیں۔ جن میں سات مفرد یعنی ایک ہی رکن کو بار بار کہنے سے پیدا ہوتی ہے، اور بارہ دو رکنی ہیں۔

ایک رکن کی تکرار سے جو سات بحریں بنی ہیں ان کے نام یہ ہیں:-

(۱) متقارب (۲) متدارک (۳) رجز (۴) ہزج (۵) رمل

(۶) کامل (۷) وافر

مُفرد اور دور کُنی بحور مع امثلہ کا نقشہ
دوسری طرف دیا جاتا ہے

بحور

نام بحر	وزن بحر	مثا
متقارب مثمّن سالم	فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن	نہاں جب ہوا ماہ کامل ہمارا
متدارک سالم	فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن	مٹ گئے عشق میں امتحاں ہو چکا
رجز مثمّن سالم	مُستفعلن مُستفعلن مُستفعلن مُستفعلن مُستفعلن مُستفعلن مُستفعلن مُستفعلن	جب مشک بھر کے نہر سے عبّاس غازی گھر چلے
ہزج مثمّن سالم	مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن	اگر بخشے زہے رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا
رمل مثمّن سالم	فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن	زہر غم قسمت سے اپنی شیر مادر بن گیا ہے

مع امثلہ

کیفیت	تقطیع	ل
ہر مصرع میں چار رکن ہوں یہ فعولن سالم ہے	تہا جب فعولن ہوا ما فعولن ہکامل فعولن ہمارا فعولن تڑپ تا فعولن رہادے فعولن رتک دل فعولن ہمارا فعولن	تڑپتا رہا دیر تک دل ہمارا
فاعلن رکن سالم ہے	مٹ گئے فاعلن عش قمے فاعلن ام ستحا فاعلن ہوچکا فاعلن۔ بس ستم فاعلن ہم پہ اے فاعلن آسما فاعلن ہوچکا فاعلن	بس ستم ہم پہ اے آسماں ہوچکا
چار بار وزن پہلے مصرع میں چار بار وزن دوسرے مصرع میں	جب مش کبر مستفعلن کرنہ رسے مستفعلن عب باسفا مستفعلن زی گر چلے مستفعلن اک جامکو مستفعلن ثر بر لیا مستفعلن ار خل دسے مستفعلن حے در چلے مستفعلن	اک جام کوثر بھر لیا اور خلد سے حیدر چلے
	اگر بخشے مفاعیلن زہے رحمت مفاعیلن نہ بخشے تو مفاعیلن شکایت کا مفاعیلن سرے تسلی مفاعیلن مخم ہے جو مفاعیلن مزاجے یا مفاعیلن رمے آئے مفاعیلن	سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے
ہر مصرعے میں چار چار رکن ہوں۔	زہ رغم قس فاعلاتن مت سیپ ئی فاعلاتن شی رمادر فاعلاتن بن گیا ہے فاعلاتن جو لیا سا فاعلاتن غر دمج کو	جو لیا ساغر وہ مجھ کو جام کوثر بن گیا ہے

نام بحر	وزن بحر	مثال
کامل مثمن سالم	متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن	جو نسیم صبح لپٹ گئی کسی گل کے دامن پاک سے
وافر مثمن سالم	مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن	

دو رکنی بارہ بحریں یہ ہیں:-

۱) طویل ۲) مدید ۳) بسیط ۴) مضارع ۵) مقتضب ۶) مجتث
بحور مع

نام بحر	وزن بحر	مثال
طویل مثمن سالم	فعولن مفاعیلن فعولن مفاعیلن فعولن مفاعیلن فعولن مفاعیلن	
مدید مثمن سالم	فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن	

ل	تقطیع	کیفیت
	فاعلاتن جام کوثر فاعلاتن بن گیا ہے فاعلاتن:	
تو شاعر مے مہر اگ چھڑی بڑی اس کو اسے آکے رشک ہے	جنسی مصب متفاعلن حلپٹ گئی متفاعلن کسگل کدا متفاعلن منپک سے متفاعلن تشاعمہ متفاعلن رن اک پھڑی متفاعلن جڑاس ک ۱۱ متفاعلن کشاک سے متفاعلن	
		عین مکسور اور لام مفتوح ہے یہ بحر عرب کے لئے مخصوص ہے۔ اردو میں اس بحر میں کوئی غزل نظر نہیں آتی

۷) منسرح ۸) سریع ۹) جدید ۱۰) قریب ۱۱) خفیف ۱۲) مشاکل

امثلہ

ل	تقطیع	کیفیت
		مختصہ عرب
		مختصہ عرب

نام بحر	وزن بحر	مثال
	فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن	
بسیط مثمن سالم	مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن	
مضارع مثمن سالم	مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن	
مقتضب مثمن سالم	مفعولات مستفعلن مفعولات مستفعلن مفعولات مستفعلن مفعولات مستفعلن	
مجتث مثمن سالم	مستفعلن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن	
منسرح مثمن سالم	مستفعلن مفعولات مستفعلن مفعولات مستفعلن مفعولات مستفعلن مفعولات	
سریع مسدس سالم	مستفعلن مستفعلن مفعولات مستفعلن مستفعلن مفعولات	
جدید مسدس سالم	فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن	
قریب مسدس سالم	مفاعیلن مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن مفاعیلن فاعلاتن	
خفیف مسدس سالم	فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن	
مشاکل مسدس سالم	فاعلاتن مفاعیلن مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن مفاعیلن	

ل	تقطیع	کیفیت
		مختصۂ عرب
		یہ بحر اردو میں سالم مستعمل نہیں ہوتی
		یہ بحر اردو میں سالم مستعمل نہیں ہوتی
		یہ بحر اردو میں سالم نہیں آتی.
		یہ بحر اردو میں سالم نہیں آتی ۔
		یہ بحر اردو میں سالم نہیں آتی۔
		مختصۂ عجم
		مختصۂ عجم
		یہ بحر اردو میں سالم نہیں آتی
		مختصۂ عجم

ایک مصرع میں جتنے رکن ہوں، انھیں دگنا کرکے بحر کے نام رکھتے ہیں۔ جیسے مثلث۔ مربع۔ مسدس۔ مثمن۔ عربی کے شعروں میں تین اور دو جزو کی بھی بحر ہوتی ہے۔ اور فارسی اور اردو میں مسدس اور مثمن کے سوائے مستعمل نہیں۔

زحاف | علم عروض کی اصطلاح میں زحاف ان تغیرات کو کہتے ہیں جو شعر کے رکن یا ارکان میں واقع ہوں۔ ارکان اگر اشعار میں اپنی اصلی صورتوں پر قائم ہیں تو بحر کو سالم کہیں گے اور جس بحر کے کسی رکن یا ارکان میں تغیر ہوگا، خواہ وہ تغیر کسی حرف کی زیادتی سے ہو یا ایک سے زائد حرفوں کو گرا دینے سے، خواہ ساکن کو متحرک کر دینے سے اسے مزاحف کہتے ہیں۔ زحاف کے سبب سے رکن میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے، اور اس تبدیلی سے ایک بحر سے دوسری بحر بن جاتی ہے۔

تقطیع | لغت میں تقطیع کے معنی پارہ پارہ کرنا ہیں۔ اصطلاح میں شعر کے اجزا کو بحر کے ارکان پر وزن کرنے کا نام تقطیع ہے۔ چوں کہ ارکان بحر سے ہم وزن کرنے کے لئے الفاظِ شعر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جاتے ہیں۔ اس سبب سے یہ نام رکھا گیا۔ تقطیع میں ساکن کے مقابل ساکن اور متحرک کے مقابل متحرک واقع ہونا ضروری ہے۔ خواہ الفاظ کلمات ثابت رہیں یا نہ رہیں۔ تخصیص حرکت کی واجب نہیں، یعنی یہ ضروری نہیں کہ کسرہ ـِ کے مقابل کسرہ اور فتحہ ـَ کے مقابل فتحہ اور ضمہ ـُ کے مقابل ضمہ ہو۔ جیسے طوطی، فعلن کے وزن پر ہے۔

تقطیع میں ان حرفوں کا اعتبار کیا جاتا ہے، جو بولنے میں آتے ہیں۔ اگر کوئی حرف لکھا جاتا ہو، لیکن پڑھا نہ جاتا ہو تو اس کو تقطیع میں شمار نہیں کیا جاتا، اور کبھی حرکت کو بجائے حرف اور کبھی حرف کو بجائے حرکت شمار کرتے ہیں۔

تقطیع کرنے کے اور بھی چند قاعدے ہیں۔ جو اس مختصر سی کتاب میں طوالت کے خیال سے درج نہیں کئے گئے

مثال

تصور دل کو رونے میں ہے کس کافر کی کاکل کا
کہ تار اشک میں ہے میرے عالم تار سنبل کا

تصور دل مفاعیلن ، کرونے میں مفاعیلن ، ہکس کافر مفاعیلن ،
کِکاکل کا مفاعیلن ، کتارے اش مفاعیلن ، یکمے ہے مے مفاعیلن
رعالم تا مفاعیلن ، رسن بل کا مفاعیلن

ختم شد

جالب مظاہری
اسماعیل بیگ محمد ہائی اسکول
محمد علی روڈ
بمبئی ۳

۵۔ جنوری ۱۹۵۵ء

مشقیہ اشعار

بحرِ متقارب مثمّن سالم

بلا ہے مری شام فرقت نہیں ہے
کہ جس کی سحر تا قیامت نہیں ہے
تری محفل ناز سے اٹھنے والے
نگاہوں میں تجھ کو لئے جا رہے ہیں
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں
غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا
عجب حوصلہ ہم نے غنچوں کا دیکھا
تبسّم پہ ساری جوانی لٹا دی
تکلّم کے انداز خاموشیوں میں
زبانِ نظر پر حیا کی کہانی
مجھے گُل کے ہنسنے پہ آتا ہے رونا
کہ اس طرح ہنسنے کی خو تھی کسی کی

بحرِ متدارک سالم

بجلیاں جان و دل پر گرانے لگے
وہ ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگے

التفات مسلسل بلا ہو گیا
میں ہی گھبرا کے ان سے خفا ہو گیا
دل کچھ اس طرح تڑپا تری یاد میں
میں یہ سمجھا ترا سامنا ہو گیا
دل مرا لے گیا وہ بت نازنیں
سنگ دل، بے وفا، مہروش، مہ جبیں

بحر رجز مثمّن سالم

اے شاہ خوبانِ جہاں شایاں ہے تجھ کو دلبری
اعجاز عیسیٰ لب میں ہے، آنکھوں میں سحر سامری
ادنیٰ بھی اس کے فیض سے رتبے میں اعلیٰ ہو گیا
ذرّے سے سورج بن گیا، قطرے سے دریا ہو گیا
ساغر مے گل رنگ کا بھر کر مجھے دے ساقیا
زہد و ورع جھگڑا ہے کیا عہد جوانی مفت ہے

بحر ہزج مثمن سالم

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے رہتا ہے
مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردش قسمت سے ڈر جانا
محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جاں پر

خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے
تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے
نہیں ممکن نظارہ عارض رنگین جاناں کا
کیا ہے آئینے نے کام دیوار گلستاں کا
نگاہ ناز نے اب قتل کا بیڑا اٹھایا ہے
ہزاروں بے گناہوں کی شہادت ہوتی جاتی ہے

بحر کامل مثمن سالم

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
نہ وہ شور طور و کلیم ہے، نہ وہ زور برق و شرار ہے
دل ناشکیب کو کیا کہوں کہ ہلاکِ جلوہٗ یار ہے
کروں سیر تیرے بغیر یہ کہاں تاب ہے دلِ زار میں
میں بہار باغ کو کیا کروں جو نہیں ہے تو ہی بہار میں
پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اُسے آہ دامن باد نے سر شام ہی سے بجھا دیا

عثمان حسین خاں نے اجمل پریس پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳ میں چھاپا
اور ہندوستانی پرچار سبھا نے ایڈن وال منشن چوپاٹی بمبئی ۷ سے
شائع کیا۔